WHAT SATISFIES HUMAN INSTINCT

ISLAM OR CHRISTIANITY ?

ALLAMA BARAKAT ULLAH, M.A.F.R.A.S
Fellow of the Royal Asiatic Socieity London

علامہ برکت اللہ

دینِ فطرت

مسیحیت یا اسلام

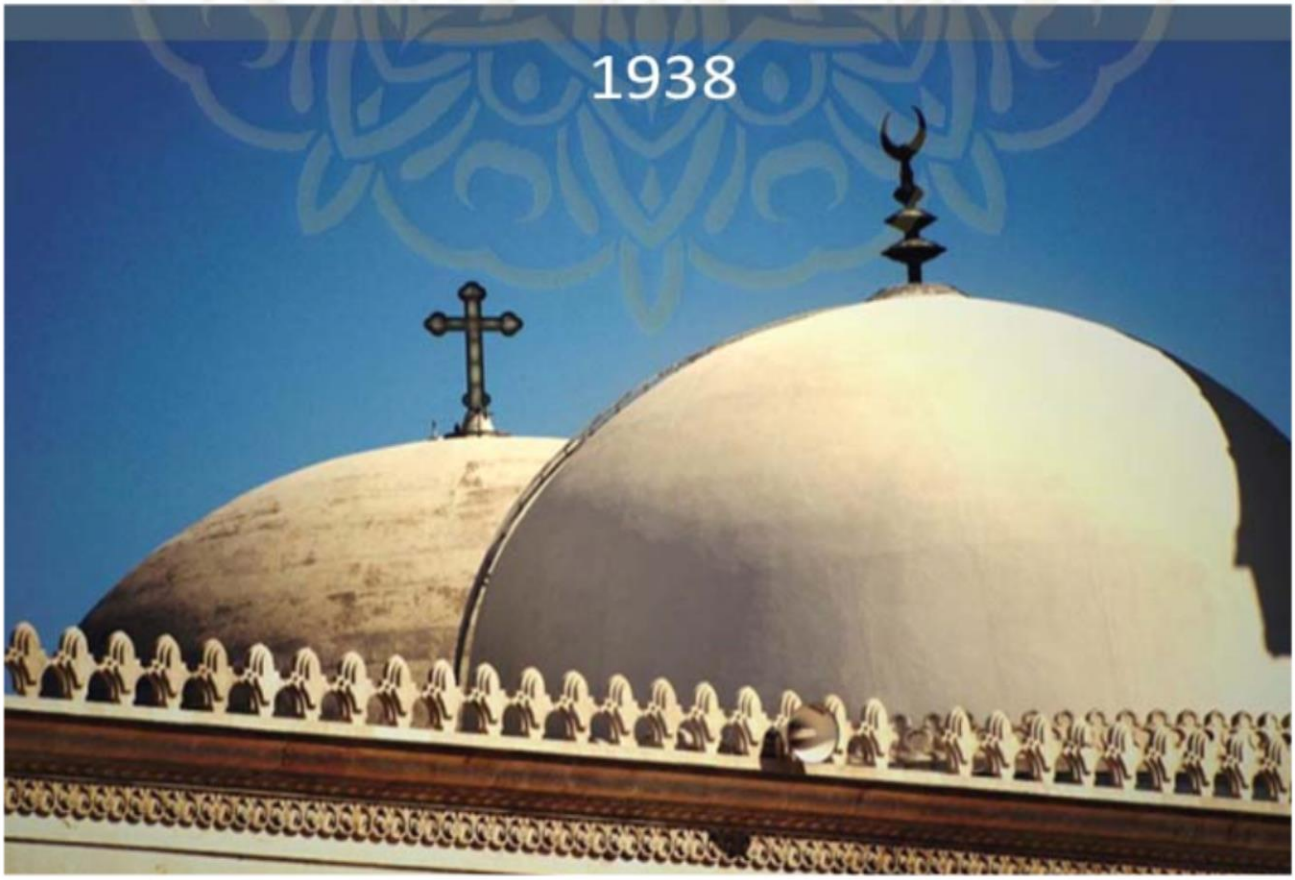

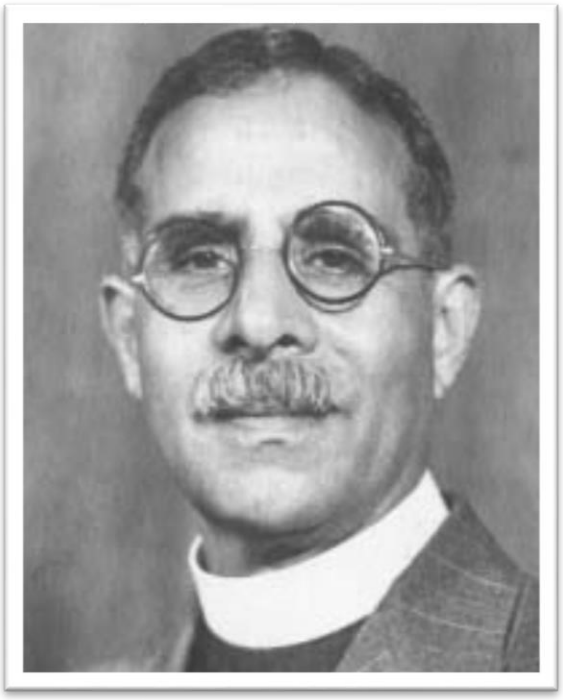

1891-1972

ALLAMA BARAKAT ULLAH, M.A.F.R.A.S

Fellow of the Royal Asiatic Socieity London

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
۱	دیباچہ مصنف	4
۲	فصل اول۔ جبلّی میلانات اور ان کی خصوصیات	8
3	فصل دوم۔ خوف کی جبلّت	51
4	فصل سوم۔ جنسی جبلّت	۳۲
5	فصل چہارم۔ والدینی جبلّت	۱4
6	فصل پنجم۔ لڑاکا پن کی جبلّت	56
7	فصل ششم۔ تجسّس اور استفسار کی جبلّت	68
8	فصل ہفتم۔ اجتماع پسندی کی جبلّت	94
9	فصل ہشتم۔ جبلّت تحکم و عجز	۱06
۱0	فصل نہم۔ جبلّت حصول و اکتساب	۱۱4
۱۱	فصل دہم۔ خلاصہ کتاب	۱3۱

دیباچہ

اسلام اور نیچریت

اہل اسلام اپنے مذہب کی حقانیت کے ثبوت میں بسا اوقات (بعض دفعہ) یہ دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ اسلام فطرت کے عین مطابق ہے۔ لہٰذا وہ برحق ہے۔

اگر ہم غلطی پر نہیں تو غالباً سرسید مرحوم بالقابہ ہندوستانی مسلمانوں میں پہلے شخص تھے۔ جنہوں نے اہل مغرب سے نیچری نظریہ کا سبق سیکھ کر اسلام میں نیچری مذہب کی بنیاد ڈالی۔ اور یہ دعویٰ کیا کہ "اسلام دین فطرت ہے"۔ آپ نے ''الاسلام ہو فطرۃ والفطرۃ ہی الاسلامہ'' کا نعرہ بلند کیا۔ انیسویں (۱۹) صدی میں مغرب کے سائنس دان نیچریت (فطرت) کے حامی اور دلدادہ (عاشق) تھے۔ ہندوستان میں مغربی علوم کی روشنی نئی نئی آئی تھی لہٰذا تعلیم یافتہ مغرب زدہ مسلمان بقول شخصے۔

در پس آئنہ طوطی صفتم داشتہ اند

آنچہ استادِ ازل گفت ہماں میگوئم

سائنس اور نیچریت کے عاشق ہوگئے۔ انہوں نے خدا اور رسول سے منہ موڑ لیا۔ مذہب کے نام سے بیزار ہوگئے۔ اور دین کے اصول کو بالائے طاق رکھ دیا۔ سرسید مرحوم نے ہندی اسلام کی نبض پر ہاتھ رکھا مرض کی تشخیص کی اور علاج یہ ڈھونڈا کہ اسلام کو نیچری لباس سے آراستہ اور پیراستہ کیا جائے تاکہ تعلیم یافتہ مسلمان از سرِ نو اسلام کے حلقہ بگوش (فرمانبردار، غلام) ہو جائیں۔ مرحوم کی زیرِ قیادت ہر طرف سے یہ آواز آنے لگی کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ معدودے چند (بہت تھوڑے) علمائے اسلام نے نیچریت کے خلاف آواز اٹھائی۔ اور سر سید مرحوم پر کفر کا فتویٰ صادر کیا۔ لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز (بہت شور وغُل میں کمزور آواز کو کوئی نہیں سُن سکتا، بڑے آدمیوں کی رائے کے مقابلہ میں چھوٹوں کی آواز ان سنی ہو کر رہ جاتی ہے) کون سنتا ہے۔ رفتہ رفتہ نیچریت کا خمیر اپنا اثر کرتا گیا، یہاں تک کہ دقیانوسی (پرانے) ملانے (عالم فاضل) بھی اب یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اسلام دینِ فطرت ہے لہٰذا سچا ہے۔

نیچریت کے نظریہ کا حشر

لیکن اس اثنا مغرب کے خیالات نے پلٹا کھایا۔ علمائے مغرب جو انیسویں(۱۹)صدی میں نیچریت کے شیدائی تھی۔ بیسویں(۲۰)صدی کے آغاز میں اس نظریہ کے بدنما داغوں سے مطلع ہونے لگے۔ نیچریت کے نظریہ کے حسن وقبح(عیب،برائی)کا چرچا عام ہو گیا۔ اور اب حالت یہ ہو گئی ہے کہ گذشتہ صدی میں خالص نیچریت کے نظریہ کا ماننے والا ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔ اب "نیچریت" کے معنی تک بدل گئے ہیں۔ فطرت اور مافوق الفطرت میں جو امتیاز اور حد فاصل مقرر کی گئی تھی۔ اب بیسویں(۲۰)صدی کے علم کی روشنی میں وہ دیوار گر گئی ہے۔ چنانچہ علامہ سر محمد اقبال کہتے ہیں۔

> "علم طبعیات نے اپنے بنیادی اصول کی جانچ پڑتال کی ہے۔ اور جس بُت کو اس نے نصب کر رکھا تھا۔ اس نے خود توڑ ڈالا ہے۔ اور اب سائنس نے مادیت کے خلاف بغاوت اختیار کر لی ہے۔ بالخصوص پروفیسر انسٹائن (Prof Enstin) کے ہاتھوں سے مادہ کے تصور کو جو کاری ضرب پہنچی ہے۔ اس سے مادیت جانبر (محفوظ، صحیح سلامت) نہیں ہو سکی"[1]۔

لیکن ہمارے مسلم برادران بمصداق "زمین جنبد نہ جنبد گل محمد تاحال سر سید مرحوم کا سکھایا ہوا سبق رٹ رہے ہیں"۔

لفظ فطرت کا مفہوم

ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ نیچریت کے معنی بھی وہ نہیں رہے جو انیسویں(۱۹)صدی میں رائج تھے۔ پس لازم ہے کہ اس مضمون پر بحث کرنے سے پہلے ہم لفظ نیچریت یا فطرت کے مفہوم کو متعین کر دیں تاکہ مبحث (بحث یا تفتیش کا کام) خلط (ملاوٹ) نہ ہو جائے۔ بعض اوقات لفظ "فطرت" لفظ "خدا" کا مترادف ہوتا ہے۔ لیکن ہم اس رسالہ میں اس لفظ کو ان معنوں میں استعمال نہیں کریں گے۔ بعض اوقات اس لفظ سے مراد "خلقت" یا "کائنات" ہوتی ہے۔ لیکن ہم یہاں لفظ فطرت کو ان معنوں میں بھی استعمال نہیں کریں گے۔ بعض اوقات لفظ "فطرت" کو فلسفیانہ جامہ پہنایا جاتا ہے۔ اور اس سے مراد وہ نظریہ ہوتا ہے جس کو "فطرت" یا "نیچریت" یا مذہب عقلی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ نظریہ اپنی خالص عریانی (ننگا ہونا، برہنگی) صورت میں خدا، روح اور تمام روحانی امور اور قویٰ کا انکار کرتا ہے۔ اس نظریہ کا لازمی نتیجہ کفر الحاد اور مادیت (جسمانیت) ہے۔ ہم اس رسالہ میں لفظ "فطرت" کو ان معنوں میں بھی استعمال نہیں کریں گے۔ کیونکہ یہ نظریہ سرے سے اس رشتہ اور تعلق کی نفی کرتا ہے۔ جو خدا اور انسان میں ہے۔ اور جس کو دین یا مذہب کہتے ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس ہم اس رسالہ میں ذیل کے قضایا (قضیہ کی جمع، جھگڑے فساد، مباحثے) کو فرض کر لیں گے۔

---

[1] ۔(Iqbal Religious Thought)

(۱)خدا ہست ہے۔ (۲)خدا نے انسان کو خلق کیا ہے۔(3)خدا اور انسان میں تعلق اور رشتہ پیدا اور قائم ہو سکتا ہے۔(4)خدا نے انسان اور انسانی قویٰ کو کسی خاص مقصد کی خاطر پیدا کیا ہے۔(5)گو انسان کے جبلّی قویٰ (فطری قوت،پیدائشی قوت)اور انسانی تاریخ معاشرت اور تمدن کا مجرد (اکیلا،غیر شادی شدہ،وہ شے جو مادہ سے پاک ہو)مطالعہ ہم کو اس مقصد کی خبر نہیں دیتا۔ جس کی خاطر انسان خلق کیا گیا ہے۔ تاہم مطالعہ اس امر کی تائید ضرور کرتا ہے۔ کہ خالق نے انسان کو بے وجہ پیدا نہیں کیا۔ بلکہ انسانی تاریخ ہم کو ان مختلف منازل سے آگاہ کر سکتی ہے۔ جن میں سے بنی نوع انسان کو اس مقصد کے حصول کے لئے گزرنا ہے(رومیوں ۲: ۱۴) ۔ہم اس رسالہ میں ان مفروضات کو ثابت کرنے کی بے سود کوشش کر کے اپنے اور اپنے ناظرین کا قیمتی وقت ضائع نہیں کریں گے ۔ اور نہ اس رسالہ کو بلا ضرورت طول دیں گے ۔ کیونکہ کسی معقول شخص کو جو مغرب کے انیسویں(۱۹)صدی کے نظریہ نیچریت کے پنجہ سے آزاد ہو گیا ہے مذکورہ بالا امور کے ماننے میں دقت نہیں ہو گی۔

اس رسالہ ہم لفظ "فطرت" کو صرف ان جبلّی قویٰ کے لئے استعمال کریں گے ۔ جو انسان میں ودیعت (امانت،سپردگی) کئے گئے ہیں۔ یہ جبلّی قویٰ وہ طبعی میلانات (رُجحان) ہیں جو ہر انسان کی فطرت میں داخل ہیں اور جن کے جائز اور مناسب استعمال سے ہر انسان اس منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ جو اس کی ہستی کی علت غائی (نتیجہ ،حاصل، پھل،وجہ) ہے۔اس رسالہ میں ہم مسیحیت اور اسلام کو صرف اس کسوٹی (وہ پتھر جس پر سونے کو پرکھا جائے) پر پرکھیں گے ۔ تاکہ معلوم کریں کہ ان دونوں مذاہب میں سے کس مذہب میں انسان کو اس کے منزلِ مقصود تک پہنچانے کی صلاحیت موجود ہے۔ مسیحیت کا یہ دعویٰ ہے کہ صرف سیدنا عیسیٰ مسیح انسان کے جبلّی قویٰ اور طبعی میلانات کو خدا کے ازلی ارادہ اور مقصد کے مطابق پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں۔ صرف ابن اللہ ہی ان وسائل کو بہم پہنچا سکتے ہیں۔ جن کو اختیار کرنے سے انسانی فطرت کی تمام جائز ضروریات بدرجہ احسن پوری ہو سکتی ہیں۔ صرف کلمتہ اللہ ہی اس تعلق کو قائم استوار اور زندہ رکھ سکتے ہیں۔ جو خدا اور انسان میں ہونا چاہیے۔ مسیحیت کا یہ دعویٰ ہے کہ ان معنوں میں صرف وہی اکیلا مذہب ہے جو دین فطرت کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔

مخالفین کو مراعات

اس رسالہ میں ہم نے اس بات کو خاص طور پر ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ کہ علم نفسیات کی بحث میں سند صرف ان ماہر علما کی لی جائے جو مسیحیت کے حلقہ بگوش نہیں ہیں۔ چنانچہ اسی خیال کو مد نظر رکھ کر ہم نے پروفیسر مکڈوگل کی کتب پر اپنی بحث کا انحصار رکھا ہے۔ مسیحیت اپنے مخالفین کو ہر طرح کی رعایت دینے کو تیار ہے، کیونکہ ان تمام مراعات (رعایت،مروت،لحاظ) کے باوجود اس میں اپنے سب حریفوں (دشمنوں) پر غالب آنے کی صلاحیت موجود ہے۔

ہم نے اس رسالہ میں اہل اسلام کو ایک اور رعایت دے دی ہے یعنی ہم نے اسلامی عقائد بیان کرتے وقت صرف قرآنی آیات ہی سے استدلال کیا ہے۔ اور اگر کہیں احادیث وغیرہ کے حوالے دیئے ہیں۔ تو ان کو صرف قرآنی آیات کی تائید تشریح اور توضیح کی خاطر پیش کیا ہے۔ اس بات کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ مجرد احادیث اور کتب فقہ پر استدلال کی بنیاد نہ رکھی جائے۔ پس بطور ایک مستقل دلیل کے ہم نے حدیث اور فقہ کی کتب سے ایک

اقتباس بھی پیش نہیں کیا۔ حالانکہ ہم کو اپنے خیالات اور دلائل کی تائید میں ایسا کرنے کا حق حاصل ہے۔ کیونکہ احادیث کے بغیر قرآن ایک عقدہ لاینحل (وہ مشکل مسئلہ جو حل نہ ہو) ہے۔ اور اسلام کی بقا کے لئے احادیث لازمی ہیں۔ لیکن ہم کو خوب معلوم ہے۔ کہ جب ہمارے مسلمان بھائیوں کو کوئی چھٹکارا کی راہ نہیں سوجھتی تو احادیث صحیحہ کو موضوع اور صادق راویوں کو کاذب (جھوٹا) قرار دینے میں ان کو ذرا باک (ڈر، خوف) نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہم نے اتمام حجت کی خاطر اپنے استدلال (ثبوت) کی بنیاد صرف قرآن پر رکھی ہے۔ اور اہل اسلام کو اس راہ فرار کا موقعہ نہیں دیا۔

خاتمہ

ہم نے کوشش کی ہے کہ اس رسالہ کے مضمون پر نہایت متانت (سنجیدگی) سے بحث کی جائے۔ تاکہ ہمارے مسلمان برادران ٹھنڈے دل سے ان اہم امور پر غور کر کے مُنجی عالمین سیدنا عیسیٰ مسیح کے قدموں میں آکر ابدی زندگی حاصل کریں۔ ع

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین ا با د

میں ان تمام احباب کا شکر گزار ہوں۔ جنہوں نے اس رسالہ کی تالیف میں میری مدد کی ہے۔ جزاہم اللہ فی اللہ فی الدارین خیرا۔ لیکن میں ان کی کرمفرمائیوں کا ناجائز فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا۔ پس میں نہ تو ان کو اور نہ ایس۔ پی۔ سی۔ کے کو اس رسالہ کی ترتیب یا دلائل یا خیالات کا ذمہ دار گردان سکتا ہے۔ بلکہ میں اس رسالہ کا بطور مصنف خود ذمہ دار ہوں۔

ہولی ٹرنٹی چرچ۔ لاہور

برکت اللہ

یکم جنوری 1938ء

فصلِ اوّل

جبلّی میلانات اور ان کی خصوصیات

جبلّی میلانات

جیسا ہم دیباچہ میں ذکر کر چکے ہیں اس رسالہ میں لفظ "فطرت" سے ہماری مراد انسان کے ان جبلّی قویٰ سے ہے جن کا تعلق نفسیات کے ساتھ ہے اور جو تمام دنیا کے انسانوں میں خواہ وہ کسی قوم ملک یا زمانہ کے ہوں مشترک پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ہر شخص فطرتاً اکلاپے (تنہائی) سے گھبراتا ہے۔ اور اپنے ہم جنسوں میں رہ کر زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ ہر ایک انسان کی سرشت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ خوفناک اشیا سے ڈرتا ہے۔ اپنے بیوی بچوں سے پیار کرتا ہے۔ اگر اس کو کوئی ایسی شئے نظر آجائے جو اس نے پہلے نہ دیکھی ہو تو اس کے متعلق متجسس ہوتا ہے۔ یہ باتیں ہم کو سکھلائی نہیں جاتیں، بلکہ ہماری پیدائش ہی سے ہمارے اندر موجود ہوتی ہیں۔ اور ہم کو ورثہ میں ملتی ہیں۔

خدا نے یہ جبلّی قویٰ انسانی سرشت میں ودیعت فرمائے ہیں تاکہ ان کی مناسب نشوونما اور ان کے جائز استعمال سے انسان اس درجہ اور کمالیت کو حاصل کر سکے۔ جو اس کی پیدائش کا اصلی منشا تھا۔ خالق نے انسان کو ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس نے انسانی سرشت میں یہ قواء ودیعت فرمائے ہیں۔ اگر یہ جبلّی قواء (قوت) مقصد الٰہی کے مطابق نشوونما پائیں گے۔ تو وہ اپنی فطرت کے مطابق زندگی کے مختلف مدراج کو طے کر کے انسان کو پاکیزگی کے اس کمال درجہ پر پہنچا دیتے ہیں۔ جو خُدا کے منشا کے عین مطابق ہے، لیکن اگر یہ جبلّی قویٰ خالق کے ارادہ کے مطابق نشوونما نہیں پاتے تو وہ انسانی فطرت کے خلاف زندگی کے مختلف مدارج میں انسان کو روز بروز بد سے بدتر بنا کر بالآخر شیطان کا ہم شکل بنا دیتے ہیں۔

چونکہ مذہب کا واحد مقصد یہ کہ خُدا اور انسان کے درمیان رشتہ اور تعلق کو زندہ رکھے۔ لہٰذا وہ صرف وہی مذہب دین فطرت کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ جو اس تعلق کو بدرجہ احسن قائم اور استوار رکھ سکتا ہے۔ اور یہ تعلق صرف اسی حالت میں قائم رہ سکتا ہے۔ جب ہماری سرشت کے جبلّی قویٰ اپنی فطرت کے مطابق نشوونما پا کر الٰہی ارادہ اور منشا کے مطابق استعمال ہوں۔ پس دین فطرت وہ مذہب ہے جو ہمارے جبلّی قویٰ کو ان کی فطرت یعنی منشائے الٰہی کے مطابق نشوونما پانے میں راہ نما ہو۔ اور ان کے جائز اور مناسب استعمال کے وسائل کو اختیار کرنے میں مدد و معاون ہو۔ عالمگیر مذہب بھی صرف وہی ہو سکتا ہے۔ جو اس معنی میں دین فطرت ہو۔ پس عالمگیر مذہب کا یہ کام ہے کہ ان جبلّی قویٰ کو جو انسانی فطرت میں ودیعت کئے گئے ہیں الٰہی منشا اور ارادہ کے مطابق کامل کرے اور انسانی فطرت کی ضروریات کو حل کرنے کے لئے ان وسائل کو بہم پہنچائے۔ جن کے ذریعہ انسان کامل ہو سکتا ہے۔

مسیحیت کا یہ دعویٰ ہے کہ صرف سیدنا عیسیٰ مسیح ہمارے جبلّی قویٰ کو خدا کے ازلی ارادہ اور منشا کے مطابق پایہ تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں۔ اور ان وسائل کو بہم پہنچاتے ہیں۔ جن کو اختیار کرنے سے انسانی فطرت کے تمام تقاضے الٰہی ارادہ کے مطابق بدرجہ احسن پورے ہو سکتے ہیں۔ اس طرح منجی عالمین سیدنا مسیح حقیقی تعلق کو قائم استوار اور زندہ رکھتے ہیں۔ جو خدا اور انسان میں ہونا چاہیے۔

جبلّی قویٰ کی اقسام

جبلّی قویٰ اور میلان مختلف انواع واقسام کے ہیں۔ ہم یہاں جبلّی رجحانات اور میلانات کی صرف ان اقسام کو لیں گے۔ جو نہایت اہم بسیط (وسیع)، اولیٰ (بہتر، اچھا) اور ابتدائی ہیں۔ اور اس بحث کو صرف ان تک ہی محدود رکھیں گے۔ کیونکہ دیگر انواع کے میلانات ان کے تابع اور ماتحت ہیں۔ لہٰذا جو کچھ ان اہم بسیط اور ابتدائی رجحانات پر صادق ہو گا۔ وہ ان تمام دیگر انواع کے میلانات پر بھی عائد ہو گا جو بسیط نہیں بلکہ مرکب ہیں۔

جبلّی رجحانات کی وہ بڑی قسمیں جو بسیط۔ ابتدائی اور ناقابل تحلیل ہیں۔ حسب ذیل ہیں۔

(۱) خوف کی جبلّت (۲) جبلّتِ جنسی یا جبلّت تولید مثل نوعی (3) ماں باپ کی جبلّت یا والدینی جبلّت (4) لڑاکا پن یا غصہ کی جبلّت (5) تجسس اور استفسار (دریافت کرنے) کی جبلّت (6) جبلّت اجتماع پسندی (7) جبلّت عجز واطاعت اور جبلّتِ تحکم وخود نمائی (8) جبلّتِ حصول واکتساب (ذاتی محنت سے حاصل کرنا)۔

جبلّی میلانات کی خصوصیات

مندرجہ بالا اقسام کے رجحانات ہر فرد بشر میں پائے جاتے ہیں۔ اور انسانی طبیعت کا خاصہ ہیں۔

(۱)

یہ رجحانات اور میلانات ابتدائی اور بسیط ہیں اور ہر انسان کی سرشت میں داخل ہیں۔ مثلاً دنیا میں کون ایسا شخص ہے جو یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ ڈر اور خوف کو جانتا ہی نہیں یا جس کی پدری محبت (والد کی محبت) اپنے بچوں کی مصیبت دیکھ کر جوش میں نہیں آتی۔ ہاں مختلف طبائع (طبیعت کی جمع) میں فرق ضرور ہوتا ہے۔ اور ہر انسان میں یہ جبلّی قویٰ برابر طور پر نہیں پائے جاتے۔ اگر ایک شخص میں ایک جبلّی میلان زیادہ غالب ہے۔ تو دوسرے شخص میں دوسرا میلان زیادہ زور دکھاتا ہے۔

جبلّی رجحانات مختلف اشخاص میں ان کی طبائع کے مطابق مختلف اوقات اور مختلف صورتوں میں نمودار ہوتے ہیں۔ مثلاً خوف ہماری سرشت میں ایک جبلّی میلان ہے۔ لیکن ہر انسان میں خوف برابر طور پر ظاہر نہیں ہوتا۔ ایک شخص کسی دہشت انگیز شئے مثلاً سانپ یا شیر کو دیکھ کر خوف کے مارے سہم

جاتا ہے۔ لیکن دوسرا شخص اس سے خوف نہیں کھاتا۔ بلکہ وہ کسی اور شئے سے لرزہ براندام (جسم کا کانپنا) ہو جاتا ہے۔ ہر شخص میں خوف ایک ہی صورت میں ظاہر نہیں ہوتا۔ گو ہر شخص کی سرشت میں خوف موجود ضرور ہے۔

(۲)

خالق نے یہ جبلّی رجحانات اور میلانات پیدائش ہی سے ہماری سرشت میں ڈال رکھے ہیں وہ اکتسابی نہیں۔ یعنی وہ انسان کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ بلکہ ہر انسان کو ورثہ میں ملتے ہیں۔ اور زندگی کے مختلف مدارج اور منازل میں مختلف اوقات پر ظہور میں آتے ہیں۔ مثلاً بچپن کے زمانہ سے ہی جبلّت تجسس واستفسار ظہور میں آتی ہے، لیکن اس میں جبلّت جنسی یا تولیدِ مثل اور والدینی جبلّت ظاہر ہوتی ہے جب وہ سن بلوغت کو پہنچتا ہے۔ مرد اور عورت کی باہمی کشش اس سے پہلے ظہور میں نہیں آتی بلکہ خفتہ حالت میں رہتی ہے اور وقتِ معینہ پر بیدار ہوتی ہے۔

(3)

ہر جبلّی میلان کا ایک خاص مقصد ہوتا ہے۔ مثلاً تولید مثل کی جبلّت کا مقصد نسل کی افزائش ہے۔ تحصیل واکتساب کی جبلّت کا مقصد زندگی کی مختلف ضروریات کو فراہم کرنا ہے۔

لیکن جب بعض حالات میں کسی رجحان کا مقصد بآسانی حاصل ہو جاتا ہے تو ہم اس رجحان یا میلان کی طاقت یا فاضل قوت کو کسی دوسرے مقصد کے حاصل کرنے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ مثلاً بدامنی کے زمانہ میں جب ملک کا حال ابتر ہوتا ہے۔ تو ہر انسان کا اولین مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنی جان کی حفاظت کرے۔ لیکن صلح کے زمانہ میں مہذب ممالک میں اس میلان کی یعنی جان کی حفاظت کی چنداں (کچھ بھی) ضرورت نہیں رہتی۔ بیرونی حالات ہی ایسے ہوتے ہیں کہ جان کو کسی قسم کا خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ اندریں حالات ہم اس میلان کی طاقت کو دیگر مقاصد کے حاصل کرنے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ اور الٰہی منشا یہ ہے کہ جب ہم کسی ایک میلان کی طاقت کو اس کے خاص مقصد سے منتقل کر کے کسی دوسرے مقصد کے لئے استعمال کریں۔ تو وہ مقصد اعلیٰ مقصد ہو مثلاً ایک شخص کی بیوی مر جاتی ہے اور اپنے پیچھے ننھے بچے چھوڑ جاتی ہے۔ اب تقاضائے فطرت یا بالفاظ دیگر عقل سلیم یہ چاہتی ہے کہ خاوند اپنے بچوں کی خاطر دوسری شادی کرنے سے پرہیز کرے اور الٰہی منشا کے مطابق جبلّت تولید مثل کی طاقت کو ایک اور اعلیٰ مقصد کو حاصل کرنے یعنی بچوں کی پرورش اور تربیت وغیرہ کی جانب راغب کرے۔

پس ایک قسم کے طبعی میلان کی قوت کو دوسرے اعلیٰ مقصد کے حصول کی جانب راجع (رجوع، راغب) کرنا ایک قدرتی اور فطرتی بات ہے۔ مثلاً تمام فنون لطیفہ ان جبلّی میلانات کے دیگر اعلیٰ مقاصد کی جانب منقلب (پلٹنے والا) ہونے کا ہی نتیجہ ہیں۔ اور یہ بات تقاضائے فطرت یا عین الٰہی منشا کے مطابق ہے۔ اور ان میلانات کی فطرت میں داخل ہے۔ لیکن اگر ہم ان میلانات کی طاقت اور رجحانات کی فاضل قوت کو ان کی فطرت اور الٰہی ارادہ کے مطابق یعنی کسی اعلیٰ مقصد کی جانب راغب کرنے کی بجائے بُرے مقاصد کی طرف راغب کر دیتے ہیں تو ہم سے ایسی لغو اور بے ہودہ حرکات سرزد ہوتی ہیں جو فطرت کے خلاف ہیں۔ مثلاً اگر ہم تولید مثل کی جبلّت کی وافر یا فاضل طاقت کو بنی نوع انسان کی بہبودی اور فلاح کے لئے استعمال کریں۔ تو

یہ عین فطرت کے مطابق اور الٰہی منشا کے مطابق ہو گا۔ لیکن اگر ہم اس میلان کی فاضل طاقت کو غیر فطری حرکات کی جانب یا زناکاری کی طرف منقلب کریں گے۔ تو یہ افعال خلاف فطرت یعنی خالق کے ارادہ کے خلاف ہوں گے۔

لہٰذا یہ نہایت ضروری ہے۔ کہ جب ان جبلّی رجحانات اور میلانات کی طاقت کا رخ کسی دوسرے مقصد کے حصول کی جانب منقلب کیا جائے۔ تو وہ دوسرا مقصد اعلیٰ ترین مقصد ہو۔ ان رجحانات اور میلانات کا استعمال تب ہی جائز قرار دیا جاسکے گا۔ جب وہ اعلیٰ ترین تصورات اور مقاصد کے ماتحت ہوں گے۔ اس اہم نکتہ کو سمجھنا اشد ضروری ہے۔ کیونکہ اس کا ذکر بار بار اس رسالہ میں کیا جائے گا۔

(4)

یہ جبلّی میلانات بذات خود نہ تو اچھے ہوتے ہیں اور نہ بُرے۔ انسان پیدائش ہی سے نہ تو گنہگار ہوتا ہے اور نہ نیکوکار پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ یہی ہماری جبلّی رجحانات اور میلانات ہماری خصلتوں کی اساس ہیں۔ جس طرح روئی سے کپڑا بنتا ہے اور جس شکل کا کپڑا ہم اس سے بنانا چاہیں ہم بنا سکتے ہیں۔ اسی طرح ان میلانات سے ہماری عادات اور خصائل شکل پذیر ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کو ہم ایک اور مثال سے واضح کرتے ہیں۔ علم کیمیائی کی دریافتیں انسان کی بہبودی اور ترقی کا وسیلہ ہوتی ہیں۔ اور یہی دریافتیں انسانی نسل کی بربادی کا وسیلہ ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ابی سینیا کے ملک کو اطالوی فوجوں نے زہریلی گیس سے سے فنا کر دیا تھا۔ اسی طرح ہماری میلانات کا استعمال بنی نوع انسان کی فلاح اور بہتری کا باعث یا اس کے تنزل اور بربادی کا باعث ہو جاتا ہے۔ اگر ان نشوونما الٰہی منشاء اور ارادہ کے مطابق ہو تو انسان خدا کی صورت پر بن جاتا ہے۔ لیکن اگر ان کا استعمال ناجائز طور پر کیا جائے۔ تب انسان شیطان کا ہم شکل بن جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص میں تولید مثل کی جبلّت یا جبلّت جنسی الٰہی منشا کے مطابق نشوونما پائے تو وہ شخص روحانی مدارج کو طے کرتا ہوا کاملیت کی طرف گامزن ہو کر فرشتہ سیرت بن جاتا ہے۔ لیکن اگر یہی رجحانات غیر مناسب اور ناجائز طور پر اس میں نشوونما پائیں تو وہ ایسے افعال کا مرتکب ہوتا ہے۔ جو خلاف فطرت ہیں اور انسان شیطان خصلت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر جبلّت حصول واکتساب جائز طور پر استعمال کی جائے تو انسان خدا کے منشا کے مطابق روحانی ترقی کرتا ہے۔ لیکن اگر اس کا ناجائز استعمال کیا جائے تو چوری، لالچ، لوٹ مار، ملک گیری وغیرہ کا ارتکاب کرتا ہے اور یہ افعال خدا کی نظر میں مقبول نہیں۔ کیونکہ خدا نے ان افعال کے لئے اس جبلّت کو ہماری فطرت میں ودیعت نہیں فرمایا تھا۔

(5)

اگر ہم غور سے مشاہدہ کریں۔ تو ہم دیکھیں گے کہ انسان جس سوسائٹی میں چلتا پھرتا ہے۔ اس کی صحبت کا اثر ان جبلّی قویٰ پر پڑتا ہے۔ انسان کے گردو پیش کے حالات اور ماحول اس کو ایسا موثر کر دیتے ہیں کہ اس کے جبلّی قویٰ کا رجحان اور میلان اور ان کا استعمال ان حالات کے مطابق ہو جاتا ہے۔

صحبتِ صالح ترا صالح کند

صحبتِ طالح ترا طالح کند

یہ روز مرہ کا مشاہدہ ہے۔ کہ اگر کسی صالح نیک مرد کا بچہ بری صحبت میں پڑ جائے۔ تو اس کے گرد و پیش کے حالات اس کو رفتہ رفتہ ایسا متاثر کر دیتے ہیں کہ وہ بدترین خلائق ہو جاتا ہے۔

پسر نوح یابداں بہ نشست

خاندان نبوتش گم شد

ان میلانات کا یہ خاصہ ہے۔ کہ اگر کسی میلان کا رجحان کسی ایک طرف ہو جائے تو اس کی رغبت اس خاص طرف کو زیادہ مائل ہو جاتی ہے اور اس جبلّت کی اقتضا (خواہش کرنا، تقاضا) کی قوت کا اظہار اس خاص جانب ہونے لگتا ہے اور اگر اس رجحان کو شروع سے ہی نہ روکا جائے تو اس خاص بات کی عادت پڑ جاتی ہے۔ اور پھر اپنی عادت سے مجبور ہو کر اس جبلّت کی اقتضا کو صرف اسی خاص طریقہ سے ظاہر کرتا ہے۔ اسی لئے۔

سر چشمہ شاید گرفتن بمیل

چو پر شد نشائد گذشتن زپیل

ہر شخص اس حقیقت کو اپنے تلخ تجربہ سے جانتا ہے کہ جب ہم کو کسی چیز کی لت پڑ جاتی ہے۔ تو اس کو ترک کرنا کیسا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اگر ہماری کسی جبلّت کی طاقت اور قوت صرف ایک ہی جانب ناجائز طور پر مائل اور راغب رہی ہو۔ تو اس سے پیچھا چھڑانا جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص بار بار چوری کرنے یا جوا کھیلنے یا زنا کرنے کا مرتکب ہوا ہو تو اس کو ان باتوں کی ایسی عادت پڑ جاتی ہے کہ جب موقعہ ملتا ہے وہ ہر بار ان مکروہ باتوں کا ارتکاب کرتا ہے۔ وہ اس امر سے بخوبی واقف ہوتا ہے کہ یہ باتیں ناجائز ہیں۔ لیکن باوجود اس علم کے وہ اپنی عادت سے مجبور ہو کر چوری کرنے یا شراب پینے کے موقعہ کی تاک میں رہتا ہے۔ ہر انسان اپنے تجربہ کی بناء پر جانتا ہے کہ ہم اپنی عادتوں کے غلام ہوتے ہیں۔ ہم کو یہ علم ہوتا ہے کہ فلاں کام سے ہم کو پرہیز کرنا چاہیے۔ لیکن جب آزمائش آتی ہے تو ہماری اس خاص جبلّت کا میلان خود بخود اسی جانب مائل ہو جاتا ہے۔ اور ہم دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ ہماری قوت ارادی کمزور ہو کر صلب (چھین جانا) ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حالی مرحوم نفس کے حملے اور عقل کی طاقت کی نسبت کہتے ہیں:

جب کیا حملہ دیئے سب عقل نہ ہتھیار ڈال

زور بازو پر ہمیشہ جس کے اتراتے تھے ہم

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم گناہ کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں۔ کیونکہ جس شئے کا ہم ارادہ کرتے ہیں وہ نہیں کرتے لیکن جو نہیں کرنا چاہتے وہی کرتے ہیں۔ اور کرنے کے بعد پچھتاتے ہیں۔ اور اپنے آپ سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ البتہ نیک ارادہ تو ہم میں موجود ہوتا ہے۔ مگر نیک کام ہم سے بن نہیں پڑتے۔ چنانچہ جس نیکی کا ہم ارادہ کرتے ہیں وہ تو نہیں کرتے۔ مگر جس بدی کا ارادہ نہیں کرتے۔ وہ اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر ہم کر لیتے ہیں۔ اور اپنے ہاتھوں سے لاچار ہو کر پکار اٹھتے ہیں۔ ”ہائے میں کیسا کمبخت آدمی ہوں۔ اس بدعادت کی قید اور غلامی کی زنجیروں سے مجھے کون چھڑائے گا“؟

دیکھ عادت کا تسلط میں نے عادت سے کہا

گھیر لی عقلِ صواب اندیش کی تو نے جائے حالی

جبلّی میلانات اور دینِ فطرت

دینِ فطرت کا یہ کام ہے کہ ہر انسان کو خواہ وہ بدترین خلائق (خلق کی جمع، مخلوقات) ہی کیوں نہ ہو۔ گناہ کی غلامی سے رہائی دے۔ اور اس کو توفیق بخشے کہ وہ اپنی جبلّت کی قوت کے میلان کو بدی کی جانب راغب کرنے کی بجائے نیکی کی جانب راغب کر سکے۔ یاد رہے کہ جتنی کسی جبلّت کی قوت شدید ہو گی۔ اتنا ہی زیادہ انسان کے لئے اس کی قوت کے میلان کی رغبت کو بدلنا ہو گا۔ مثلاً ایک زانی کے لئے جبلّتِ جنسی کی رغبت کا منقلب کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ضرور ہے کہ جو توفیق دینِ فطرت عطا کرے اس کی قوت جبلّت کی قوت سے بہت زیادہ قوی (طاقت ور) ہو۔ تاکہ میلان کی اکتسابی قوت زائل ہو سکے۔

ایسے شخص کو جو اپنے گناہ کے پنجہ میں گرفتار ہے۔ محض یہ نصیحت کرنا کافی نہیں ہوتا کہ نیک بنو یا نیکوں کی صحبت اختیار کرو۔ وہ برا فعل کرنے سے پہلے ہی جانتا ہے کہ جو فعل وہ عادت سے مجبور ہو کر کرتا ہے گناہ ہے اس کو علم کی ضرورت نہیں۔

حضرت ناصح اگر آئیں دیدہ و دل فرش راہ

پر کوئی یہ بتلادے کہ وہ فرمائیں گے کیا؟

(۲)

اسلام اور دیگر کل مذاہب اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ کہ گنہگار کو نیکی کا درس دے دیں اور نصیحت کر دیں۔ اس سے زیادہ وہ نہیں کرتے اور نہ کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن ہر شخص تجربہ سے جانتا ہے کہ نصیحت کی قوت جبلّت کی زبردست طاقت کے سامنے ہیچ ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ کارگر نہیں ہوتی۔ اور نہ ہو سکتی ہے۔ پند و نصیحت کی آواز نہایت دھیمی اور مدھم ہوتی ہے۔ جو میلانات کے سیلاب کے جوش و خروش میں سنائی بھی نہیں دیتی۔ لہٰذا وہ طوفان بدتمیزی کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہوتی ہے۔ اگر جبلّت کے میلان کی قوت کے رجحان کو ایک طرف سے ہٹا کر دوسری طرف راغب کرنا منظور ہو تو اس کے لئے لازم ہے کہ ایسی زبردست طاقت ہماری شامل حال ہو۔ جس کی قوت کے سامنے جبلّت کی قوت ہیچ ہو اور یہ زبردست طاقت ہماری زندگی میں ایسے طور پر داخل ہو کہ اپنی قدرت کے کرشمے سے جبلّت کی قوت کے میلان کو ایک طرف سے ہٹادے اور دوسری جانب راغب کر دے۔ اگر ہم اس طاقت کے لئے "ط" کا حرف استعمال کریں۔ اور قوت ارادی کے لئے "الف" اور جبلّت کی قوت کے لئے "ج" اور عقل اور نصیحت کے لئے حرف "ن" استعمال کریں۔ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ج کی طاقت ا+ن سے زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن ا+ن + ط درجہ بدرجہ (آہستہ آہستہ) سے طاقتور ہو جاتے ہیں۔ جب ہم اس زبردست طاقت کی مدد سے توفیق حاصل کرتے ہیں۔ تو ہماری قوت ارادی میں جو سلب ہو گئی تھی نئی جان پڑ جاتی ہے۔ اور ہم اپنی جبلّت کی

رغبت پر غالب آجاتے ہیں۔ اور اس کی قوت کے میلان کو ایک نئی جانب راغب اور منقلب کرتے ہیں تو ہم گویا از سر نو پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہم نئے مخلوق بن جاتے ہیں۔

(3)

مسیحیت ہی ایک واحد مذہب ہے۔ جو یہ نئی پیدائش ہم کو عطا کرتا ہے۔ جناب مسیح ہی اکیلے ہادی ہیں جو نہ صرف ہم کو راہِ ہدایت بتاتے ہیں (یوحنا ۱۴: ۶) بلکہ ہم کو وہ زبردست طاقت عطا فرماتے ہیں۔ جس کی مدد سے ہم اپنی جبلّت کی طاقت کو ایک جانب سے ہٹا کر دوسری طرف راغب کر سکتے ہیں۔ اس کے ہی فضل سے ہم کو یہ توفیق عطا ہوتی ہے۔ (یوحنا ۱: ۱۶۔۱۷؛ متی ۱۱: ۲۸؛ یوحنا ۷: ۳۷؛ ۴: ۱۴؛ رومیوں ۲: ۲۴؛ ۵: ۲۰؛ ۱۵: ۱۰؛ ۲۔کرنتھیوں ۹: ۸؛ گلتیوں ۲: ۲۱؛ افسیوں ۱: ۷؛ ۲: ۷۔۸؛ ۴: ۷؛ ۱۔تیمتھیس ۱: ۱۴؛ ۲۔تیمتھیس ۱: ۹؛ ۲: ۱؛ طیطس ۲: ۱۱؛ ۳: ۷؛ عبرانیوں ۴: ۱۶ وغیرہ وغیرہ) اور یہ محض انجیل کا دعویٰ ہی نہیں بلکہ تجربہ اس دعویٰ کی تصدیق بھی کرتا چلا آیا ہے۔ چنانچہ دو ہزار سال سے روئے زمین کے مختلف ممالک اور ازمنہ مختلف اقوام اور طبائع کے لوگ بیک زبان اقرار کرتے چلے آئے ہیں۔ کہ جناب مسیح نے ان کی شیطانی خصلتوں اور مذموم (خراب، وہ جس کی برائی کی جائے) عادتوں سے اپنے فضل کے وسیلے ان کو توفیق عطا کر کے نجات عطا فرمائی ہے۔ ہر مسیحی کا یہ تجربہ ہے کہ "جہاں گناہ زیادہ ہوا وہاں فضل اس سے بھی بہت نہایت زیادہ ہوا"۔ گناہ کی مزدوری یا نتیجہ روحانی موت ہے۔ لیکن ہم مسیحی اپنے آقا و مولا سیدنا مسیح کے ذریعہ خدا کا شکر کرتے ہیں۔ کہ خدا کی بخشش ہمارے آقا و مولا میں ہمیشہ کی زندگی ہے۔

پس "اگر کوئی مسیح میں ہے تو وہ نیا مخلوق ہے۔ پرانی چیزیں جاتی رہیں۔ دیکھو وہ نئی ہو گئیں" (۲۔کرنتھیوں ۵: ۱۷)۔

قرآن ان جبلّتوں کی قوت کے تقاضاؤں کے میلانوں کو ایک جانب سے ہٹا کر دوسری جانب راغب کرنے سے قاصر ہے۔ وہ نیک اعمال کی دعوت تو دیتا ہے۔ لیکن نہ تو نئی پیدائش کی تعلیم دیتا ہے۔ نہ کسی شخص کو نیا مخلوق بنانے پر قادر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ دین فطرت کے لوازم (لازم کی جمع، ضروری چیزیں) اس میں سرے سے نہیں ہیں۔ لہٰذا وہ دینِ فطرت کہلانے کا مستحق بھی نہیں ہو سکتا۔ تمام ادیانِ عالم میں مسیحی دین کو ہی یہ طغرائے امتیاز (وہ خصوصیت اور لیاقت جو کسی اور میں نہ ہو) حاصل ہے۔ کہ وہ تمام ممالک و ازمنہ میں بدترین خلائق کے میلانات کو چاہ ضلالت سے نکال کر صراط مستقیم پر چلاتا رہا ہے۔ اور یوں عملاً ثابت کر دیا ہے کہ وہ ایسا کرنے پر قادر ہے۔ لہٰذا مسیحیت ہی دینِ فطرت ہے۔

فصل دوم

خوف کی جبلّت

خوف کی جبلّت کی خصُوصیات

خوف کی جبلّت تمام حیوانات کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ انسانی سرشت میں یہ جبلّت قوی ترین جبلّتوں میں سے ہے۔ دنیا میں ایسا کون شخص ہے جو خوف کو نہ جانتا ہو۔ اور اس کی طاقت سے واقف نہ ہو؟ خوف کی جبلّت کا یہ خاصہ ہے۔ کہ ہم جس شے سے خوف کھاتے ہیں ہم اس سے یا بھاگتے ہیں یا پوشیدہ ہو جاتے ہیں اور یا مدافعت (دفع کرنا، روک) کی خاطر اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ پس اس جبلّت کے ساتھ فراری یا پوشیدگی یا مدافعت ملزوم (لازم کیا گیا، جو جدا نہ ہو سکے) ہے۔

یہ بات تصریح (تشریح، واضح کرنا) کی محتاج نہیں کہ بنی نوع انسان کی بقا کے لئے یہ جبلّت نہایت کار آمد اور مفید ہے۔ مثلاً اگر ہم خوف کے مارے کسی شیر سے نہ بھاگیں۔ یا اس سے روپوش نہ ہوں یا اس کا مقابلہ نہ کریں۔ تو ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ لیکن ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اگر اس جبلّت پر غیر معمولی زور دیا جائے تو مفید ہونے کی بجائے یہ جبلّت وبال جان ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر ایک شخص ہر وقت خوف کا شکار رہے تو اس کی زندگی معرض خطر میں پڑ جائے گی۔ کیونکہ جب ہم کو خوف لاحق ہوتا ہے تو ہمارے جسم کے مختلف حصے نہایت سخت کوشش پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور اگر خوف کا اثر ہمارے جسم پر لگاتار رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اعضائے رئیسہ اس جسمانی شدت کی کوشش کو سنبھال نہیں سکتے۔ اور بعض اوقات خوف کے مارے موت واقع ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی سنسان جنگل میں اکیلا ہو اور اس کی نظر بار بار جنگلی درندوں پر پڑے تو ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس بات کا اثر اس کے جسم پر اور اعضائے رئیسہ پر کتنا ہوتا ہو گا۔ پس اگر خوف کی جبلّت متواتر تحریک میں رہے تو انسان کے دل میں ہول (ڈر) بیٹھ جاتا ہے۔ جس کے ساتھ ایسا اعصابی اضطراب (بے قراری) واقع ہوتا ہے کہ اعضائے رئیسہ مضمحل (کمزور، اداس) ہو جاتے ہیں۔

اس جبلّت کی غیر معتدل (اعتدال والا، درمیانی درجہ کا) برانگیختگی (طیش میں بھرا ہوا) کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ناواجب شدت اور تکرار عمل سے انسان ہر وقت خوف زدہ ہو کر سہار رہتا ہے۔ اس کا اثر دل کی حرکت پر تنفس (سانس لینے) پر اور جسم کے مختلف اعضا پر ہوتا ہے۔ خوف کے مارے انسانی ذہن کام کرنے سے جواب دے دیتا ہے۔ کیونکہ خوف کے مارے انسان کو اور کچھ نہیں سوجھتا اور خوف اس کی تمام توجہ کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے اور اس کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات یہ اثر ذہن پر استوار اور محکم ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیداری اور خواب میں ہر لحہ خوف (انسان) کا دامن گیر رہتا ہے۔

خوف کی جبلّت اور دینِ فطرت کے لوازمات

پس دینِ فطرت کے لئے یہ شرط نہایت ضروری ہے کہ خوف کی جبلّت کا جائز اور معتدل استعمال کرے اور اس کو اعتدال کے ساتھ بر قرار رکھے۔ یہ لازم ہے کہ دین فطرت کے عقائد ایسے ہوں۔ جن سے اس جبلّت کی غیر معتدل برانگیختگی واقع نہ ہو۔ تاکہ انسان ہول اور دہشت کا نشانہ نہ بنا رہے۔ اور خوف کے بُرے نتائج سے انسان کی زندگی محفوظ رہے۔

جبلّتِ خوف اور اسلام

علمِ نفسیات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسانی ترقی کی ابتدائی منازل میں خوف اور دہشت کا عنصر اقوام پر غالب رہتا ہے۔ بدنی سزا اور جسمانی تعزیر و تعذیب (دکھ دینا، سرزنش کرنا) کا خوف ان اقوام اور جماعتوں کو ہمیشہ قابو میں رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی اور وحشی مذاہب اور مذاہب باطلہ (جھوٹے مذاہب، ناحق مذاہب) میں خوف دہشت اور ہول کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ ان کے دیوی دیوتاؤں کا امتیازی نشان ظلم اور خونخواری ہوتا ہے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ جس قدر کسی مذہب میں دہشت کا عنصر غالب ہو گا اسی نسبت سے وہ مذہب ادیانِ عالم (دنیا کے دین) کی قطار میں ادنیٰ پایہ (کم حیثیت) کا شمار کیا جائے گا۔

اسلام میں خوف کا عنصر اسی طرح کارپرداز ہے۔ جس طرح وحشی اقوام کے مذاہب باطلہ میں دیوتاؤں کا خوف کام کرتا ہے۔ چنانچہ مشہور مستشرق (وہ فرنگی جو مشرقی زبانوں اور علوم کا ماہر ہو) سر ٹامس آرنلڈ کی کتاب میں ہے کہ

> ”زمانہ جاہلیت میں قبائل عرب کے دیوی دیوتا اپنے اپنے پرستاروں کے محافظ اور بادشاہ تصور کئے جاتے تھے۔ اسلام میں اللہ نے ان دیوتاؤں کی جگہ لے لی اور ان کی بجائے اب اللہ انہی معنوں میں ان قبائل کا بادشاہ اور محافظ قرار دے دیا گیا ہے۔ اللہ دنیاوی بادشاہوں کی طرح مسلمانوں پر حکمران ہے۔ چنانچہ اسلامی افواج اللہ کی فوج ہے۔ اسلامی خزانہ اللہ کا خزانہ ہے“۔

اسلام کے تمام محرکات کا اصل خدا کا خوف اور وعیدِ عقوبت و تعذیب (سزا دینے کا وعدہ) ہے۔ قرآن میں خدا کی ان صفات پر زور دیا گیا ہے۔ جن سے خوف ٹپکتا ہے۔ اور انسان مرعوب (ڈرنے والا)، دہشت زدہ اور لرزہ براندام رہتا ہے۔ اللہ کے چند اسمائے حسنہ یہ ہیں:

خالق، باری، عالی، رفیع، عظیم، کبیر، متعالی، جلیل، قدیر، مجید، قوی، مقتدر، قادر، والی، مالک، عزیز، حاکم، حسب، متکبر، مزمل، جبار، قابض، خافض، ضار، قہار، ممیت، منتقم، وغیرہ وغیرہ۔ اللہ ذوالجلال والاکرام ہے (رحمٰن آیت 78) اس کی مثال بلند ہے (نحل آیت ۶۲) وہ رب العرش ہے (توبہ آیت 130 مومنون 88) وہ مشرق و مغرب آسمان و زمین کا مالک ہے۔ جو گنہگاروں سے محبت نہیں رکھتا (بقر آیت 186) وہ سرکشوں کو عذاب دیتا ہے (نحل

۲5،احقاف ۱۹، جاشیہ 7و ۲۰ مومن 37و ۶۲و6و76، زمر 60و ۱6و ۷۲ صافات 34۔ نحل ۱3۔ لقمان 6 انعام 93 وغیرہ) یہ عذاب اٹل ہے (طورع۔۱۱) وہ جلد حساب لینے والا ہے (مائدہ 6 وغیرہ) جس کی پکڑ سخت تکلیف دہ ہے (ہود ع 9۔ نحل ع 6) وہ سخت عذاب دینے والا ہے (بقر آیت ۱۹۲) وغیرہ وہ بجلی کے کڑاکے بھیجتا ہے اور جس پر چاہے گراتا ہے (رعد 13) جس کو چاہتا ہے عذاب دیتا ہے (مائدہ 44) وہ گنہگاروں فاسقوں کی ہدایت نہیں کرتا (توبہ آیت ۱۱0، مائدہ 107 وغیرہ)۔ حالانکہ اگر وہ چاہتا تو سب کو ہدایت پر کردیتا (انعام آیت 150) سب چاروناچار اسی کو سجدہ کرتے ہیں (رعد آیت 16) آسمان اور زمین میں کوئی نہیں ہے۔ جو اللہ کے پاس غلام ہو کر حاضر نہ ہو۔ کیونکہ اللہ نے ان کو گھیر رکھا ہے۔ اوران کا شمار کرر کھا ہے (مریم 93) چنانچہ آخری دن جب سب لوگ اپنی قبروں سے باہر نکلیں گے تو اللہ فخریہ ان سے پوچھے گا کہ اب بتاؤ آج کے دن کس کی بادشاہت ہے اور پھر فاتحانہ انداز میں خود ہی جواب دیا گا کہ اللہ واحد قہار کی (مومن 16) اللہ کے ننانوے نام ہیں۔ جن میں سے اکتالیس نام ایسے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کی ذات میں وہ تمام صفات پائی جاتی ہیں جو انسان کے دل میں دہشت اور ہول پیدا کرتی ہیں۔ چنانچہ کتب احادیث میں اس پر زور دیا گیاہے۔ "مشکواۃ باب الرقاق فے البکاؤالخوف" میں ابوہریرہ سے روایت ہے کہ

> "آنحضرت نے فرمایااس خدا کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ اگر تم اس کی نسبت وہ بات جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم زیادہ روتے اور تھوڑا ہنستے"۔

اسی طرح "کتاب الفتن" میں ہے کہ

> "آنحضرت نے فرمایا کہ اے لوگ خوب روؤاور لوگوں کو رلاؤ"

پس صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن وحدیث کے مطابق اللہ اور انسان کا باہمی تعلق زبردست اور زیردست ہستیوں کا ہے۔ ایک خالق ہے تو دوسری مخلوق۔ ایک مالک ہے دوسری غلام ایک غالب ہے دوسری مغلوب ایک قہار ہے دوسری مقہور و مغضوب (جس پر غصہ ہو)۔ ایک جبار ہے دوسری مجبور۔ اللہ کی ہستی ضرر پہنچانے والی۔ چھین لینے والی اور اپنے غضب سے گنہگاروں کو فنا کردینے والی ایسی ہستی ہے جس کے انتقام سے کوئی فرد بشر بچ نہیں سکتا۔ کیونکہ اس نے گنہگاروں کا ٹھکانا جہنم مقرر کررکھا ہے (بنی اسرائیل آیت ۱۹) جس کے سات (۷) دروازے ہیں (حجر 44) اور جس پر انیس (۱۹) نگہبان مقرر ہیں (مدثر آیت 30) جہاں آگ کا ڈھیر سخت گرم ہو گا (مزمل آیت ۱۲) اوپر آگ کے سائبان اور نیچے بھی آگ کے سائبان ہوں گے (زمر آیت 18) آگ کبھی نہ بجھے گی۔ وہ منہ کو جھلس دے گی (مومنون 106) اور دلوں کو جھانکے گی (ہمزہ آیت 7) وہاں آگ کے کپڑے (حج ۲۱) اور گندھک کے کرتے ہوں گے (ابراہیم آیت 51) گنہگاروں کا کھانا گلا اٹکو ہو گا (مزمل آیت 13) ان کے پینے کو کھولتا پانی اور پیپ ہو گی۔ (نباء آیت ۲6) ان کو پانی گلے ہوئے تانبے کی مانند پینا پڑے گا (کہف ۲8) گرم کھولتا پانی ان کی انتڑیاں کاٹ ڈالے گا (محمد آیت 17) وہ زنجیروں اور طوق میں گرفتار ہوں گے (دہر آیت 4 سبا آیت 3۲) اور ہتھوڑوں سے پیٹے جائیں گے (حج آیت ۲۲) وہ منہ بند آگ میں دم پخت ہوں گے۔ (بلد آیت

۲۰) اور دردناک عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ وہ موت مانگیں گے (زخرف 77) لیکن وہاں نہ موت ہوگی اور نہ عذاب میں کسی طرح تخفیف (کمی) ہوگی (فاطر آیت 33) قرآن اور اسلام کے اللہ کی ذات وصفات ہی ایسی ہیں جن کے محض تصور ہی سے جسم پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے۔

بقول مولانا ظفر علی خاں

ہے طبیعی یہ وہ ڈر جس سے نہیں کوئی مفر

یہ وہ خطرہ ہے جو کنجشک کو شاہین سے ہے

(۲)

حقیقت تو یہ ہے کہ عرب کے باشندے صرف اسی قسم کے الٰہی تصور سے متاثر اور مرعوب ہوسکتے تھے۔ چنانچہ مرحوم مولانا شبلی فرماتے ہیں

"انسان کے دل میں جب خدا کا خیال ایک شہنشاہ مطلق کی حیثیت سے آیا تو ضرور تھا کہ اُسی کے صفات بھی اسی شہنشاہی رتبہ کی حیثیت سے ذہن میں آئیں۔ انسان کے شاہوں اور شہنشاہوں کے متعلق جو کچھ دیکھا یا سنا تھا۔ یہی تھا کہ اظہار اطاعت سے خوش ہوتے ہیں۔ جان نثاری، ادب، عاجزی، خشوع اور تعظیم پسند کرتے ہیں۔ اور جو شخص جس قدر زیادہ ان خدمات کو بجالاتا ہے وہ انعامِ سلطانی کا اسی قدر زیادہ مستحق ہوتا ہے۔ انہی خیالات کے لحاظ سے خدا کی عبادت کا خیال پیدا ہوا"

(الکلام حصہ دوم صفحہ 144)

چنانچہ ڈاکٹر عبداللہ ایڈیٹر ترکی اخبار اجتہاد اگست 1924ء کی اشاعت میں یوں رقمطراز ہے

"توہمات کی ابتدائی منازل میں یہ کہ ایک قدرتی بات تھی کہ ہر قوم اپنے تصور کے مطابق خدا کو متصور کرے۔ انتقام پسند عرب سے یہی امید ہوسکتی تھی کہ ان کا اللہ قادر مطلق اور انتقام پسند ہوتا۔ میں تو اس خدا کا قائل ہوں جو صرف نیک اور راستباز ہو۔ جو اگر کسی شخص پر سے آفت اور مصیبت ٹال نہ سکے تو مصیبت زدوں اور آفت رسیدوں کے ساتھ دکھ اور رنج کے وقت روئے"۔ اللہ قرآن میں کہتا ہے کہ "تحقیق ہم نے عربی زبان میں اس قرآن کو نازل کیا ہے تاکہ تم سمجھ سکو"۔ ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ قرآن صرف عرب کے لئے نازل ہوا ہے۔ اور ترکوں کا اس میں کوئی حصہ بخرہ نہیں ہوسکتا۔ عربوں نے ہم پر یہ جبر یہ اپنے خود ساختہ اللہ کو ٹھونس کر ہم کو تباہ اور برباد کر دیا ہے۔ اسلام کے اللہ میں بعض خوبیاں ہیں لیکن اس کی صفات ایسی ہیں جنہوں نے ہماری قومی نشوونما کو اپاہج اور ملی ترقی کو مفلوج کر دیا ہے۔۔۔ سلطنت ایران کے زوال کا بھی یہی سبب ہے"۔

ایک اور ترکی اخبار لکھتا ہے کہ قرآن کا اسلام

"ایک ایسا مذہب تھا جس سے ترکوں کے دل خوف اور عذاب کے مارے دہل جاتے تھے۔ مذہب اور ایمان پر جبر غالب تھا۔ جس سے حقیقی مذہب کمزور ہو گیا تھا۔ ترکی انقلاب نے جبر اور خوف کا خاتمہ کر دیا ہے"

(حکیمیتی بابت 30 دسمبر 1925ء)

اسلام کے اللہ کی ذات وصفات کے محض تصور سے انسان کے بدن پر کپکپی لگ جاتی ہے۔ دل میں ہول بیٹھ جاتا ہے خوف اور دہشت کے مارے انسان بے قرار ہو جاتا ہے۔ اعصابی اضطراب کی وجہ سے اعضائے رئیسہ مضمحل ہو جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ اسلام خوف کی جبلّت کو نہایت غیر معتدل طور پر بے اندازہ برانگیختہ کر دیتا ہے۔ جو فطرت کے قطعاً خلاف ہے۔ دین فطرت کا تو یہ کام تھا کہ وہ خوف کی جبلّت کو جائز اور معتدل استعمال کرے۔ اور اس کی غیر معتدل برانگیختگی سے انسان کو محفوظ رکھے۔ لیکن اسلام میں اللہ کا تصور ہی ایسا ہے۔ جس سے انسان کی زندگی وبال جان ہو جاتی ہے۔ چہ جائیکہ وہ اس کو اوج اعلیٰ (عروج وبلندی) پر پہنچا سکے۔ پس جب ہم اسلام کو اس کسوٹی پر پرکھتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں تک اس جبلّت کا تعلق ہے اسلام دین فطرت کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

جبلّتِ خوف اور مسیحیت

مسیحیت ہم کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ "خداوند کا خوف دانش کی ابتدا ہے" (امثال ۱: ۷)۔ "خداوند کا خوف پاک ہے" (زبور ۱۹: ۹)۔ "خداوند تمہارا خدا تم سے سوا اس کے اور کیا چاہتا ہے کہ تم خداوند اپنے خدا کا خوف مانو اور اس کی سب راہوں پر چلو اور اس سے محبت رکھو" (استثنا ۱۰: ۱۲؛ یشوع ۲۴: ۱۴؛ ۱۔ سموئیل ۱۲: ۱۴؛ ایوب ۲۸: ۲۸؛ زبور ۲۵: ۱۴ وغیرہ)۔ "خداوند سے ڈرنے والوں کی چاروں طرف اس کا فرشتہ خیمہ زن ہوتا ہے۔ اور ان کو بچاتا ہے جو اس سے ڈرتے ہیں ان کو کچھ کمی نہیں" (زبور ۳۴: ۷؛ ۶۰: ۴؛ ۸۵: ۹ وغیرہ)۔ "جیسے باپ اپنے بیٹوں پر ترس کھاتا ہے ویسے ہی خداوند ان پر جو اس سے ڈرتے ہیں ترس کھاتا ہے۔ جس قدر آسمان زمین سے بلند ہے اسی قدر اس کی شفقت ان پر جو اس سے ڈرتے ہیں" (زبور ۱۰۳: ۱۱؛ ۱۰۵: ۱۱؛ ۱۱۸: ۴؛ ۱۲۸: ۴؛ ۱۳۰: ۴؛ ۱۴۵: ۴؛ ۱۴۷: ۱۹؛ ۱۴۷: ۱۱)۔ "خداوند کا خوف بدی سے عداوت ہے" (امثال ۸: ۱۲؛ ۱۴: ۲؛ ۱۴: ۲۷)۔ "خداوند کا خوف زندگی بخش ہے۔ خدا ترس سیر ہو گا اور بدی سے محفوظ رہے گا" (امثال ۱۹: ۲۳؛ یسعیاہ ۵۰: ۱۰)۔ "تیرا دل ڈرے گا اور کشادہ ہو گا" (یسعیاہ ۶۰: ۵)۔ "تم پر جو میرے خدا کے نام سے ڈرتے ہو آفتاب صداقت طالع ہو گا۔ اور اس کی کرنوں میں شفا ہو گی" (ملاکی ۴: ۲)۔ "آؤ ہم اپنے آپ کو ہر طرح کی جسمانی اور روحانی آلودگی سے پاک کریں اور خدا کے خوف کے ساتھ پاکیزگی کو کمال تک پہنچائیں" (۲۔ کرنتھیوں ۷: ۱)۔ "خدا کے خوف میں ایک دوسرے کے تابع رہو" (افسیوں ۵: ۲۱)۔

کتاب مقدس کے مذکورہ بالا اقتباسات بطور مشتے نمونہ از خروارے (ڈھیر میں سے مٹھی بھر) دیئے گئے ہیں۔ ان سے واضح ہو گیا ہو گا کہ مسیحیت میں "خدا کا خوف" کس قسم کا ہے اور اس کا مفہوم کیا ہے۔ یہ خوف "دانش کی ابتدا" ہے "پاک" ہے۔ اس سے "خدا کی محبت" پیدا ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ "نیک نیتی اور صداقت" ہے۔ اور اس سے "دل کشادہ" ہوتا ہے۔ اس پر "آفتاب صداقت" کی کرنیں چمکتی ہیں۔ جو ہم کو "شفا" بخشتی ہیں اور وہ ہر چیز سے ہم کو محفوظ رکھتا ہے۔ یہ خوف اس قسم کا خوف ہے جو بیٹا اپنے باپ سے رکھتا ہے۔ اس تصور میں خدا کی محبت پر زور دیا گیا ہے جس کی وجہ سے انسان اپنے آسمانی باپ کی محبت کو ٹھکرانے سے ڈرتا ہے۔ اس خوف کا ہول کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ اس قسم کے خوف کا جزو اعظم محبت ہے۔ جس میں بالفاظ انجیل "دہشت نہیں ہوتی بلکہ کامل محبت دہشت کو دور کر دیتی ہے کیونکہ دہشت سے عذاب پیدا ہوتا ہے۔ اور کوئی دہشت کھانے والا محبت میں کامل نہیں ہوا" (یوحنا۴: ۱۸) یہ مسیحی تصور اعضائے رئیسہ کو کمزور اور مضمحل کرنے کی بجائے "کشادہ" کرتا ہے (یسعیاہ ۶۰: ۵)۔ "اس کی کرنوں میں شفا ہے" (ملاکی ۴: ۲) ۔ ایسے خوف سے ذہن کام کرنے سے جواب نہیں دیتا۔ اور اس سے ذہنی فعلیت کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے برعکس یہ محبت آمیز خوف قوائے ذہنی کے لئے "زندگی بخش" ہے۔ خدا کی محبت ہول کے تمام خطرناک نتائج سے ہم کو محفوظ رکھتی ہے۔ جو اشیاء پہلے ہم کو دہشت ناک دکھائی دیتی تھیں اور جو واقعات ہم کو ہولناک نظر آتے تھے۔ اب مسیحی ایمان کی روشنی میں ہم کو خدا کی محبت اور اس کی پروردگاری کے نظارے معلوم دیتے ہیں۔ وہی باتیں اب ہم کو خدا کی محبت کی مثالیں دکھائی دیتی ہیں۔ کیونکہ وہ الٰہی محبت کی روشنی سے منور ہو جاتی ہیں۔ ہم کو اب خدا کی پروردگاری اور محبت کی جھلک ان واقعات میں نظر آتی ہے جو پہلے ہم کو خوفناک دکھائی دیتے تھے۔ اور جن سے دیوی دیوتاؤں کے پرستار ابھی تک خائف و ترساں ہیں۔ انسانی زندگی وبال ہو جانے کی بجائے محبت سے معمور ہو کر پر لطف کوائف کا ایک سلسلہ لامتناہی (جس کی کچھ انتہا نہ ہو) بن جاتی ہے اور آسمانی سرور دہشت کی جگہ لے لیتا ہے (یوحنا ۱۴ باب) اور جوں جوں الٰہی محبت کا احساس ہم میں بڑھتا جاتا ہے ہماری زندگیوں میں عجیب تبدیلیاں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ اور ہم زبور نویس کے ہم نوا ہو کر پکار اٹھتے ہیں۔ "خداوند میری روشنی اور میری نجات ہے۔ مجھے کس کی دہشت؟ خداوند میری زندگی کا پشتہ (بند، وہ چمڑا یا کپڑا جس سے کتاب کی پُشت کے پٹھے جوڑے جاتے ہیں) ہے مجھے کس کی ہیبت؟ خداوند میری پناہ اور قوت ہے اس لئے مجھ کو کچھ خوف نہیں خواہ زمین کا تختہ الٹ جائے اور پہاڑ سمندر کی تہ میں ڈال دیئے جائیں خواہ اس کا پانی شور مچائے اور موج زن ہو۔ اور پہاڑ اس کی طغیانی سے ہل جائیں" (زبور ۲۷: ۱؛ ۴۶: ۱)۔

جبلّتِ خوف اور اسلامی اور مسیحی تعلیم کا موازنہ

ممکن ہے کہ کوئی کوتاہ عقل (کم عقل) یہ اعتراض کرے کہ مسیحیت بھی خدا کو خالق، باری، عالی، رفیع، عظیم، کبیر، متعالی، جلیل، قادر، قدیر، وغیرہ مانتی ہے۔ لیکن معترض کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسیحیت اور اسلام میں خدا کے تصورات میں بعد المشرقین ہے۔ مسیحیت خدا کو ان معنوں میں رفیع، عظیم، جلیل، قادر وغیرہ نہیں مانتی جن معنوں میں اسلام اللہ کو ایسا مانتا ہے۔ اسلام کا اصل الاصول یہ ہے کہ خدا منزہ (عیبوں سے پاک) ہے۔ اور وہ ایک ہیبت ناک ہستی ہے جو مندرجہ بالا تمام صفات سے متصف (جس کے ساتھ کوئی صفت لگی ہو) ہے۔ اس کے برعکس مسیحیت کا اصل الاصول یہ ہے کہ خدا باپ ہے اور اس کی ذات محبت ہے۔ محبت خدا کی محض صفت نہیں بلکہ محبت اس کی ذات ہے۔ اور مندرجہ بالا تمام کی تمام صفات اس کی ذات یعنی

محبت کی صفات ہیں۔ اور وہ ہم پر خدا کی محبت ظاہر کرتی ہیں۔ مثلاً اگر خدا قادر اور قوی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی محبت قادر ہے۔ جو بدترین گنہگار کو بھی اپنے دست قدرت سے بچا سکتی ہے۔ اگر خدا رفیع، عالی اور عظیم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی محبت کی رفعت اور عظمت کو کوئی شخص نہیں جان سکتا (افسیوں ۳: ۱۹) ۔ لیکن اسلام میں ان اسمائے جلالیہ سے یہ مطلب مقصود نہیں ہوتا بلکہ وہاں یہ صفات ایک ایسی خوفناک زبردست اور ہیبت ناک ہستی کی جانب اشارہ کرتی ہیں جسے چار وناچار (مجبوراً) انسانوں کو سجدہ کرنا لازمی اور لابدی اور ناگریز امر ہے۔ ورنہ اس کے قہر وغضب کی انتہا نہیں۔ لیکن مسیحیت کے مطابق خدا کا غصہ کسی جبار اور قہار ہستی کا قہر وغضب نہیں۔ بلکہ خدا باپ کی ازلی اور ابدی محبت کی آگ کی چنگاریاں ہیں جس کی علت غائی (حاصل، سبب) یہ ہے کہ انسان ہلاک نہ ہو۔ بلکہ بچہ کی طرح تربیت پاکر ہمیشہ کی زندگی پائے (امثال ۳: ۱۲؛ ۲۔ تیمتھیس ۱: ۷؛ عبرانیوں ۲: ۶۔۷؛ یوحنا ۳: ۱۶ وغیرہ)۔

مسیحیت کے مطابق اگر خدا ذوالجلال ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی محبت پُر جلال ہے۔ اگر خدا ازلی اور ابدی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی محبت ازلی اور ابدی ہے۔ لیکن اسلام کا اللہ اسمائے جمالیہ رکھتا ہے تو محض اپنے جلال کی خاطر مثلاً اگر وہ رحمٰن الرحیم ہے تو اس کا رحم ایک مطلق العنان قادر، قہار وجبار، مزیل، اور ممیت سلطان کا رحم ہے جو وہ اپنے مغلوب ومقہور ومغضوب غلام پر کرتا ہے۔ ایسا رحم اخلاقی عنصر سے بالکل خالی اور معرا ہے۔ کیونکہ اللہ جس مغضوب غلام پر چاہے رحم کرے اور جس پر چاہے قہر کرے۔ جس کو چاہے بخشے اور جس کو چاہے عذاب دے (مائدہ آیت 44 وغیرہ) وہ جو چاہے حکم دے (مائدہ آیت ۱ و ۲ وغیرہ) بہر حال وہ گنہگاروں، فاسقوں، فاجروں سے محبت نہیں رکھتا (بقر آیت ۹۲ وغیرہ) بلکہ وہ ان سے انتقام لیتا ہے (سجدہ ۲۲۔ زخرف 40 دخان 5 اوغیرہ)۔

پس اسلام کے اللہ کی ہستی ایک ہیبت ناک ڈراؤنی ہستی ہے۔ جو ڈرنے والوں کو ہی جزا دیتی ہے۔ (ابراہیم 17 وغیرہ) اس کا رسول ڈرانے والا نذیر ہے (احزاب 44 نساء 96 مائدہ 57 و 58 بقرہ ۲ تا 4 وغیرہ) اس کی کتاب قرآن ڈرانے والی کتاب ہے (حم سجدہ آیت 3) اس خوف اور دہشت کی وجہ سے انسان اور اللہ میں حقیقی رفاقت ممکن نہیں ہوسکتی کیونکہ رفاقت محبت کا نتیجہ ہے۔ مسیحیت کے مطابق خدا کی ذات محبت ہے۔ جو اپنی محبت کی خوبی ہم پر یوں ظاہر کرتا ہے کہ "جب ہم گنہگار ہی تھے تو مسیح نے ہماری خاطر جان دی" (رومیوں ۵: ۸؛ ۱۔ یوحنا ۴: ۹ وغیرہ)۔ "اس کے رحم کی دولت اس بڑی محبت کے سبب ہے۔ جو اس نے ہم سے کی" (افسیوں ۲: ۴)۔ اسلام کے خدا کی ذات وصفات ایسی ہیں جن سے ہر لحظہ خوف اور دہشت ٹپکتی ہے۔ لیکن مسیحیت کے "خدا نے ہم کو دہشت کی روح نہیں بلکہ قدرت اور محبت اور تربیت کی روح دی ہے" (۲۔ تیمتھیس ۱: ۷)۔ مسیحیت میں خدا کی لازوال محبت خدا کے خوف کا سرچشمہ اور منبع ہے۔ اور اس کو تحریک میں لاتی ہے۔ (رومیوں ۵: ۸؛ یوحنا ۴ باب) یہ کامل محبت انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ خدا باپ کی مرضی پر چلے۔ یہ مجبوری کسی قہار وجبار خدا کے غضب سے ہول کھانے کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ بلکہ کامل محبت کے دل میں شعلہ زن ہونے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بالفاظ انجیل "مسیح کی محبت ہم کو مجبور کرتی ہے" (۲۔ کرنتھیوں ۵: ۱۴)۔ خدا کی ذات محبت ہے۔ لہٰذا ہم کو "غلامی کی روح نہیں ملی۔ جس سے ڈر پیدا ہو۔ بلکہ لے پالک ہونے کی روح ملی ہے۔ جس سے ہم ابا یعنی اے باپ کہہ کر خدا کو پکارتے ہیں" (رومیوں ۸: ۱۵) انجیل کی خوشخبری یہ ہے کہ "جو عمر بھر موت کے ڈر سے غلامی میں گرفتار رہے۔ ان کو چھڑا دے" (عبرانیوں ۲: ۵) منجیٔ عالمین نے فرمایا: "میں تم کو اطمینان دیتا

ہوں۔ تمہارا دل نہ گھبرائے اور نہ ڈرے۔ تم مجھ میں اطمینان پاؤ۔ میں تم کو غلام نہیں کہتا۔ بلکہ میں نے تم کو دوست کہا ہے" (یوحنا ۱۴ باب) آپ نے بار بار اپنے شاگردوں اور دوسرے لوگوں کو تاکید کر کے فرمایا کہ "مت ڈرو" (متی ۱۰: ۳۱؛ لوقا ۵: ۱۰؛ ۸: ۵۰؛ ۱۲: ۳۲ وغیرہ)۔

جیسا ہم اپنے "رسالہ نوالہدیٰ" میں مفصل ذکر کر چکے ہیں۔ یہ ایک تواریخی حقیقت ہے کہ ابتدا ہی سے مسیحیت نے مختلف ازمنہ میں اقوام عالم کے کروڑوں افراد کو مذاہب باطلہ کے دہشت اور ہول اور توہمات کے تباہ کن خوف سے نجات بخشی۔ اسی واسطے خداوند کے پیغام کا نام "انجیل" یعنی خوشخبری پڑ گیا۔ کیونکہ ابتدا ہی سے یہ پیغام حقیقی معنوں میں "خوشخبری" ثابت ہوا۔ اس نے ہر فرد بشر کو ہر طرح کے ہول اور دہشت سے چھٹکارا دے دیا۔ ادیان عالم میں مسیحیت ہی ایک ایسا مذہب ہے جو خوف کی جبلّت کا جائز استعمال کرتا ہے۔ اور اس کو غیر معتدل طور پر برانگیختہ نہیں کرتا۔ بلکہ رعب احترام اور محبت کے جذبات سے دہشت کے عنصر کو دور کر کے ہر طرح کا ہول ہمارے دلوں سے نکال دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم خدا کے "فضل کے تخت کے پاس دلیری سے" آتے ہیں (عبرانیوں ۴: ۱۶)۔ جس طرح بیٹا اپنے باپ کے پاس دلیری سے آتا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ "ہمیں جو اس کے سامنے دلیری ہے۔ اس کا سبب یہ ہے۔ کہ محبت ہم میں کامل ہو گئی ہے" (۱۔ یوحنا ۵: ۱۴؛ ۴: ۱۷)۔

پس مسیحیت میں خدا کا تصور محبت پر مبنی ہے۔ جنابِ مسیح نے باپ کی محبت ہم پر ظاہر کی۔ اس ازلی ابدی اور لازوال محبت کے "احترام" نے خوف اور دہشت کے محرکات کی جگہ ہمارے دلوں میں لے لی ہے۔ جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے۔ کہ جو شخص خدا پر مسیح کے وسیلے ایمان لاتے ہیں وہ الٰہی قہر و غضب اور خداوندی عقوبت و تعذیب کے خوف سے مرعوب ہو کر خدا کے احکام پر نہیں چلتے۔ بلکہ خدا کی ازلی محبت کے احترام کا پاس کر کے خدائے قدوس کی پاک مرضی پر چلنے کا مصمم ارادہ کر لیتے ہیں۔

اسلامی تصور تاریخ مذہب کی ابتدائی منازل کا تصور ہے لیکن مسیحی تصور انتہائی منزل کا تصور ہے اور دونوں تصورات میں بعد المشرقین ہے۔

به بیں تفاوت راه از کجاست تا به کجا

پس جہاں تک خوف کی جبلّت کا تعلق ہے مسیحیت ہی اکیلا واحد مذہب ہے۔ جو ہماری سرشت کی اس جبلّت کے اقتضا کو بطرز احسن پورا کرتا ہے۔

فصل سوم

جبلّتِ تولیدِ مثلِ نوعی یا جبلّتِ جنسی

جبلّت جنسی کی خصوصیات

جنسی جبلّت کے ذریعے ایک حیوان اپنی نوع کے حیوان پیدا کرتا ہے۔ نر اور مادہ کے باہمی تعلقات اسی جنسی جبلّت کی وجہ سے ظہور میں آتے ہیں۔ انسانی معاشرت کے لئے یہ جبلّت نہایت ضروری ہے۔ چونکہ اس جبلّت سے ہر جماعت خواہ چھوٹی ہو خواہ بڑی بحال سرسبز اور قائم رہتی ہے۔ لہٰذا اس جبلّت کے لئے بیاہ اور ازدواج کا وجود اور اس حالت کا قیام نہایت ضروری امور ہیں۔

(۱)

تاریخ اقوام کا مطالعہ ہم پر یہ واضح کر دیتا ہے کہ وہی اقوام ترقی کرتی ہیں جن میں ایسے قوانین ازدواج منضبط (مضبوط کیا ہوا، پیوستہ کیا گیا) ہوتے ہیں۔ جو والدینی جبلّت یعنی ماں باپ کی جبلّت کی تائید کرتے ہیں۔ وہ قبائل اور اقوام جن میں رسم ازدواج منضبط نہیں ہوتی جلدی فنا ہو جاتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اقوام کی شائستگی اور تہذیب کا معیار ان کے ازدواج کے قوانین و قواعد ہیں۔ جن اقوام میں وحدتِ ازدواج ہے اور اس رشتہ کے قیام و بقا پر زور دیا جاتا ہے وہ اقوام شاہراہ ترقی پر گامزن ہوتی ہیں۔ لیکن جن اقوام میں وحدت ازدواج کی بجائے کثرتِ ازدواج رائج ہے اور بیاہ کے رشتہ کی طرف سے لاپرواہی اختیار کی جاتی ہے۔ اور طلاق عام روزمرہ کا واقعہ ہو جاتا ہے۔ ان اقوام میں زوال پیدا ہو جاتا ہے۔ تاریخ معاشرت یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ اقوام جن میں متعدد (کئی) بیویاں یا متعدد شوہر رکھنے کا رواج جاتا رہا۔ وہ اپنی وحشیانہ حالت کو چھوڑ کر مہذب ہو گئیں۔ لیکن وہ اقوام ترقی کے زینہ سے گر گئیں۔ جن میں وحدت ازدواج کی بجائے تعداد ازدواج اور طلاق مروج ہو گیا یا جن میں مرد و زن میں وفاداری اور باہمی اخلاص وغیرہ کے تعلقات مدت العمر (تمام زندگی) پائدار نہ رہے۔ تاریخ دنیا کے صفحات اس اصول کی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں۔ مثلاً ملک یونان کے باشندوں میں پانچویں صدی قبل از مسیح تک وحدت ازدواج کی رسم جاری تھی۔ اور اس زمانہ میں انہوں نے حیرت انگیز ترقی کی۔ لیکن جونہی ازدواج کے قوانین و قواعد ڈھیلے ہونے شروع ہو گئے۔ یونان کے زوال کے زمانہ کی ابتدا ہو گئی۔ اس ملک کے اخلاقی انحطاط کا یہ حال ہو گیا کہ ڈیمستھینز (Demosthenes) کہتا ہے کہ

> ”ہم اپنی منکوحہ بیویوں کے ساتھ اس واسطے تعلق رکھتے ہیں تاکہ ہمارے ہاں ایسے بچے پیدا ہوں۔ جن کو قانون تسلیم کر سکے۔ لیکن لذت حاصل کرنے کے لئے ہم دوسری عورتوں کو اپنے گھروں میں رکھتے“۔

وہاں ازدواج کے قواعد کے نرم اور ڈھلے ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل یونان ایک محکوم قوم بن گئے۔ اسی طرح روم میں جب تک ازدواج کے قوانین سخت تھے۔ سلطنتِ روم عروج پر رہی۔ لیکن جہاں ان قوانین کی جانب سے لاپرواہی اختیار کی گئی۔ اور تعداد ازدواج اور طلاق ایک عام بات ہوگئی تو اس سلطنت کے زوال کا زمانہ آگیا۔ اور اس اخلاقی انحطاط کا نتیجہ یہ ہوا کہ روم نے ایسی قوم یعنی جرمنوں کے ہاتھوں زبردست شکست کھائی جس میں وحدت ازدواج جاری تھی۔ اسی طرح ملک ہسپانیہ میں اسلامی فتوحات کو سرانجام دینے والی قوم بربر تھی جس میں وحدت ازدواج رائج تھی۔ لیکن جب فاتح قوم کی جڑوں کو اسلامی رسوم تعداد ازدواج اور طلاق نے کھوکھلا کر دیا۔ تو اس کو ایسا زوال آیا کہ اسلام کا نشان تک مغرب سے مٹ گیا۔

پس ظاہر ہے کہ جن ممالک میں وحدتِ ازدواج جاری ہے اور اس رشتہ کے قوانین و قواعد منضبط اور سخت ہیں۔ وہ ملک ترقی کرتے ہیں اور مہذب ہو جاتے ہیں۔ لیکن جن ممالک میں وحدت ازدواج نہیں اور اس رشتہ کے قوانین نرم اور ڈھیلے ہیں اور تعداد ازدواج اور طلاق رائج ہے۔ وہ ملک جنسی زوال پذیر ہو جاتے ہیں۔ پس یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ کہ جس ملک اور زمانہ میں ازدواج کے تعلقات مدت العمر پائدار ہوتے ہیں وہاں ترقی علم صنعت و حرفت اور تمدنی اور معاشرتی زندگی ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔ جس سے ثابت ہے کہ وحدتِ ازدواج اور ازدواجی تعلقات کی پائیداری اور قیام اور ان تعلقات کا استحکام بنی نوع انسان کی ترقی کے لئے نہ صرف ضروری ہیں بلکہ اس کی ترقی کی لازمی شرائط ہیں۔ کیونکہ بقائے نوع اس امر کی مقتضی ہے کہ ازدواج قائم رہے اور مدت العمر قائم رہے۔ جنسی جبلّت ماں باپ کی جبلّت کے ساتھ مربوط (وابستہ) اور مخلوط (ملاجلا) ہے۔ اور یہ قریبی تلازم معاشرت کے لئے نہ صرف از حد مفید بلکہ لازم اور ضروری ہے۔ اس بات میں کچھ شک نہیں کہ یہ ربط مبد فطرت سے ہے۔ علی العموم جو معروض جنسی اقتضا کا ہے۔ وہ کسی حد تک جذبہ نازک کا بھی معروض ہے۔ یہ ارتباط (میل ملاپ، دوستی) اس وفاداری اور باہمی اخلاص کی بنیاد ہے۔ جس کی وجہ سے نر اور مادہ میں وفاداری اور باہمی اخلاص وغیرہ کے تعلقات مدت العمر پائدار استوار اور قائم رہتے ہیں۔

(۲)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیوں وحدت ازدواج اور تہذیب کی ترقی لازم ملزوم ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو افراد اور اقوام جنسی جبلّت کی طرف ہی خیال رکھتے ہیں وہ شہوت کے غلام ہو جاتے ہیں۔ ان میں نر اور مادہ کے جذبات غیر معتدل طور پر برانگیختہ رہتے ہیں۔ چونکہ اس قسم کے انسانوں کا خیال ہمیشہ عورتوں کا جانب ہی لگا رہتا ہے اور وہ ان سے حظ اور لذت حاصل کرنے میں ہی اپنی قوتیں صرف کر دیتے ہیں۔ لہٰذا وہ اور کسی مصرف (کام) کے نہیں رہتے۔ ان کے اعضائے رئیسہ مضمحل ہو جاتے ہیں۔ جنسی جبلّت کی ناواجب شدت اور تکرار عمل کے باعث ان کے ذہن کسی کام کے نہیں رہتے۔ اور یوں رفتہ رفتہ ان کی ذہنی فعلیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ شہوانی خیالات کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ باقی تمام خیالات پر غلبہ پاکر انسان کی تمام توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔

(3)

لیکن جو شخص جنسی جبلّت کو صرف جائز اور معتدل طور پر استعمال کرتا ہے وہ اس جبلّت کی وافر طاقت کو دیگر اغراض اور مقاصد کے حصول میں لگا دیتا ہے۔ ہر شخص اپنے تجربہ سے اس امر کی تائید کر سکتا ہے۔ جب کوئی انسان جنسی جبلّت کو غیر معتدل طور پر برانگیختہ نہیں ہونے دیتا۔ اور اس پر قابو پالیتا ہے تو وہ اس جبلّت کی عظیم توانائی اور طاقت کو دیگر انسانی مشاغل اور اغراض و مقاصد کے حاصل کرنے میں صرف کر سکتا ہے۔ اور کر بھی دیتا ہے۔ ہمیں یہ حقیقت ہر گز فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ انسانوں میں تمام جبلّتوں سے زیادہ جبلّت جنسی مختلف وجدانیات اور اقتضاؤں کو اپنے اقتضا کی عظیم طاقت، قوت اور توانائی مستعار (چند روز، مانگا ہوا) دیتی ہے۔ چونکہ انسان کی توجہ تمام تر اسی ایک جبلّت کے استعمال پر لگی نہیں رہتی، لہٰذا وہ دیگر امور کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔ اور اس جبلّت کی توانائی کو دیگر اغراض و مقاصد کی تحصیل میں خرچ کر سکتا ہے۔ اور یہ جیسا ہم فصل اول میں ذکر کر چکے ہیں عین فطرت کے مطابق ہے۔ اس کی مثال یوں ہے جس طرح کوئی انجنیئر کسی دریا کے وافر پانی کو نہروں میں نکال دے ان نہروں کے ذریعہ زمین سرسبز اور شاداب ہو کر اپنا پھل پیدا کرتی ہے اور انسان کی مرفہ الحالی (آسودگی) کا باعث ہو جاتی ہے اسی طرح جنسی جبلّت کی وافر طاقت اور فاضل توانائی کا رجحان ان اعلیٰ اغراض اور بہترین مقاصد کے حاصل کرنے کی طرف لگانا چاہیے جن سے بنی نوع انسان کی فلاح ترقی اور بہبودی مقصود ہوتی ہے۔

جبلّت جنسی اور دینِ فطرت کے لوازمات

سطور بالا سے ظاہر ہو گیا ہو گا کہ دینِ فطرت کا یہ کام ہے کہ (۱) وحدت ازدواج کی تعلیم دے (۲) نر اور مادہ کے رشتہ کی پاکیزگی قیام، استواری اور پائیداری اور اس کی دوامی حالت کی تلقین کرے (3) طلاق کی ممانعت کرے اور (4) اس بات کا محرک ہو کہ جبلّت جنسی کی وافر اور فاضل طاقت اور عظیم توانائی اعلیٰ ترین مقاصد اور اغراض کو حاصل کرنے کی جانب راغب ہو جائے۔

جنسی جبلّت اور مسیحیت

کلمتہ اللہ (سیدنا مسیح) کی تعلیم نے آدمی اور عورت کے باہمی جنسی تعلقات کی کایا پلٹ دی جو نر اور مادہ کے تعلقات آپ کے زمانہ میں رائج تھے۔ وہ موسوی شریعت کے ماتحت تھے۔ آپ نے ان کے تمام غیر مکمل عناصر کو خارج کر کے اس رشتہ کو کامل طور پر پاکیزہ بنا دیا۔ عورت بچے جننے کی مشین اور مرد کی شہوت کا آلہ کار نہ رہی۔ بلکہ مرد کی طرح ایک آزاد ذمہ وار ہستی ہو گئی۔ جس سے خدا لازوال محبت کرتا ہے۔ اور جس کی روح کی خاطر ابن اللہ نے اپنی جان دے دی۔ خدا کی نظر میں مرد اور عورت کے حقوق مساوی ہیں۔ پس انجیل جلیل یہ تعلیم دیتی ہے کہ جنسی جبلّت کے جائز استعمال کے لئے "ہر مرد اپنی بیوی اور ہر عورت اپنا شوہر رکھے۔ شوہر اپنی بیوی کا حق ادا کرے اور بیوی شوہر کا حق ادا کرے" (۱۔ کرنتھیوں ۷: ۲)۔ کتابِ مقدس کے مطابق یہ خدا کے عین منشا کے مطابق ہے کہ مرد اپنی زندگی ایک عورت کے ساتھ رہ کر بسر کرے اور عورت اپنی زندگی ایک مرد کے ساتھ بسر

کرے۔ انسانی زندگی دونوں صنفوں کے باہمی تعلقات میں استوار اور کامل ہوتی ہے۔(پیدائش ۲: ۱۸)۔ چنانچہ لکھا ہے کہ مرد اور عورت "ایک جان ہوں گے "(پیدائش ۲: ۲۴)۔ پس انجیل جلیل نے یہ تعلیم دی ہے کہ "مرد اور عورت کے جنسی حقوق مساوی ہیں۔ اور ان کی واجبی ادائیگی کو ہر زن وشوہر پر فرض کر دیا ہے جو ان بیوہ عورتوں کو حکم دیا کہ وہ بیاہ کریں۔ اولاد جنیں اور گھر کا انتظام کریں۔ اور کسی مخالف کو بدگوئی کا موقعہ نہ دیں" (۱۔ تیمتھیس ۵: ۱۴)۔ "بیاہ کرنا سب میں عزت کی بات سمجھی جائے اور بستر بے داغ رہے" (عبرانیوں ۱۳: ۴) جو لوگ ازدواج کے رشتہ کے خلاف ہیں اور شادی بیاہ کو برا جانتے ہیں ان کی نسبت انجیل مقدس میں وارد ہوا ہے کہ "بعض لوگ گمراہ کرنے والی روحوں اور شیاطین کی تعلیموں کی طرف متوجہ ہو کر بیاہ کرنے سے منع کریں گے (۱۔ تیمتھیس ۴: ۱)۔

(۲)

مسیحیت وحدتِ ازدواج پر زور دیتی ہے۔ اور اس رشتہ کو مدت العمر پائدار قرار دے کر اس کو مستحکم اور مضبوط کرتی ہے۔ مسیحی تعلیم طلاق کو قطعی طور پر ممنوع قرار دیتی ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ فریسیوں نے آکر کلمتہ اللہ سے پوچھا "کیا یہ روا ہے کہ مرد اپنی بیوی کو چھوڑ دے"؟ آپ نے فرمایا" خلقت کے شروع سے خدا نے ان کو مرد اور عورت بنایا۔ اور وہ دونوں ایک جسم ہوں گے۔ پس وہ دو نہیں بلکہ ایک جسم ہیں۔ اس لئے جس کو خدا نے جوڑا ہے اسے آدمی جدا نہ کرے۔ جو کوئی اپنی بیوی کو چھوڑ دے اور دوسری سے بیاہ کرے وہ اس پہلی کے خلاف زنا کرتا ہے۔ اور اگر عورت اپنے شوہر کو چھوڑ دے اور دوسرے سے بیاہ کرے تو زنا کرتی ہے" (مرقس ۱۰: ۲)۔ "کوئی اپنی جوانی کی بیوی سے بے وفائی نہ کرے۔ کیونکہ خدا فرماتا ہے کہ میں طلاق سے بیزار ہوں اور اس سے بھی جو اپنی بیوی پر ظلم کرتا ہے۔ اس لئے تم اپنے نفس سے خبردار رہو" (ملاکی ۲: ۱۵) منجی عالمین کے صاف اور واضح الفاظ وحدت ازدواج کی پائیداری اور اس کے لطیف پاکیزہ اور مقدس تعلق کو نہایت صراحت اور وضاحت سے بیان کر دیتے ہیں۔ مقدس پولُس فرماتے ہیں کہ "خداوند میں نہ عورت مرد کے بغیر ہے اور نہ مرد عورت کے بغیر۔ کیونکہ جیسے عورت مرد سے ہے ویسے ہی مرد بھی عورت کے وسیلے سے ہے مگر سب چیزیں خدا کی طرف سے ہیں" (۱۔ کرنتھیوں ۱۱: ۱۱؛ رومیوں ۷: ۲ وغیرہ) ان الفاظ سے عیاں ہے کہ مسیحیت کے نزدیک عورت اور مرد کے تعلقات "خداوند" میں ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ نکاح کی حالت پاک باعزت اور دائمی حالت ہے۔ اور خدا انسان کے باہمی تعلق کی زندہ مثال ہے (مرقس ۲: ۱۹؛ مکاشفہ ۲۱: ۹؛ ۱۔ کرنتھیوں ۶: ۱۴۔۲۰)۔ مسیحی تعلیم جنسی جبلّت کی پائیداری اور استواری کی تائید کرتی ہے۔ اور اس وفاداری اور اخلاص کے قیام کی بنا ہے۔ جو مسیحی خاندانوں کو اسی دنیا میں جنت بنا دیتی ہے۔ جس میں خاوند اور بیوی کے تعلقات میں خلل اور بدنظمی واقع ہونے کی بجائے محبت، پیار اور ہمدردی کے لطیف اور نازک جذبات کی نشوونما اور تکمیل ہوتی ہے۔

مسیحیت کے مطابق ازدواج کا رشتہ ایک ایسا تعلق ہے جس کا مقصد ہرگز پورا نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ یہ رشتہ مدت العمر پائیدار نہ ہو۔ فطرت نے ازدواجی تعلقات کا مقصد بچوں کی پیدائش رکھی ہے۔ تاکہ ایک سوسائٹی معرض وجود میں آجائے۔ یا بالفاظ دیگر سوشل عمارت خاندان کی بنیاد پر کھڑی کی گئی ہے۔ اور جنسی جبلّت نے سوشل تعلقات کی صورت اختیار کر لی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر یہ جبلّت اس قسم کے تعلقات کے علاوہ کسی اور صورت میں ظاہر ہو تو افراد اور سوسائٹی دونوں کے لئے وہ خطرے کا باعث بن جاتی ہے۔

چونکہ ازدواجی تعلقات درحقیقت بچوں کی شخصیت کی نشوونما اور ترقی کا ذریعہ ہیں۔ لہٰذا لازم ہے کہ یہ تعلقات صرف ایک زوجہ سے متعلق ہوں اور مدت العمر پائیدار ہوں۔ کیونکہ انسانی بچہ دیگر تمام حیوانات کی نسبت اپنے والدین کی مدد کا زیادہ مدت تک محتاج ہوتا ہے۔ اور جو سوسائٹی زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ ہوتی ہے۔ اس میں یہ حاجت زیادہ دیرپا ہوتی ہے۔ مسیحی تصور ازدواج کا سخت مخالف لارڈ رسل (Lord Russell) بھی اس امر کو چارونار چار تسلیم کرتا ہے۔

پس ازدواج کی نسبت جو تعلیم کلمتہ اللہ نے دی ہے۔ صرف وہی فطرت کے لوازمات کے مطابق ہے۔ کیونکہ صرف وحدتِ ازدواج اور اس تعلق کی مدت العمر پائیداری اور قیام ہی نوع انسانی کی ہستی بقا اور ترقی کا موجب ہو سکتی ہیں۔

(3)

چونکہ کلمتہ اللہ کی تعلیم تعدادِ ازدواج کو حرام اور طلاق کو ممنوع قرار دیتی ہے۔ لہٰذا جنسی جبلّت کی قوت وحدت ازدواج کی وجہ سے صرف معتدل طور پر ہی استعمال ہو سکتی ہے۔ پس اس جبلّت کی وافر اور فاضل طاقت اور عظیم توانائی بنی نوع انسان کی فلاح ترقی اور بہبودی کی خاطر صرف ہو سکتی ہیں۔ چونکہ نر اور مادہ کے جذبات تعدادِ ازدواج کی وجہ سے غیر معتدل طور پر برانگیختہ ہونے نہیں پاتے۔ لہٰذا ناواجب شدت اور تکرار عمل کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اور انسانی دماغ ہر وقت جنسی تعلقات کی جانب راغب رہنے کی بجائے نئی باتوں کی دریافت اور دیگر مشغلوں میں لگ جاتا ہے۔ اور میاں بیوی دونوں کو یہ موقع مل سکتا ہے کہ جنسی جبلّت کی وافر قوت کو بے کسوں، لاچاروں، مریضوں، غریبوں، محتاجوں، یتیموں، رانڈوں اور مصیبت زدوں وغیرہ کے ساتھ ہمدردی کے ذرائع معلوم کرنے میں صرف کریں۔ یا دیگر اعلیٰ ترین مقاصد مثلاً بنی آدم کی بہبودی یا سائنس کی دریافتوں وغیرہ کی جانب اس زبردست میلان کی طاقت کے رجحان کو راغب کریں۔

کلمتہ اللہ کیوں مجرد رہے

منجی عالمین نے خود اس جبلّت کی عظیم توانائی اور تمام کی تمام طاقت کو بنی نوع انسان کی فلاح اور بہبودی میں صرف کر دیا۔ ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ یہ جبلّت تمام دیگر جبلّتوں سے زیادہ مختلف وجدانیات اور اقتضاؤں کو اپنے اقتضا کی عظیم قوت اور توانائی مستعار دے دیتی ہے اور یہ عین اس جبلّت کی فطرت کے اور الٰہی منشا کے مطابق ہے۔ پس منجی کونین نے اس جبلّت کی تمام کی تمام توانائی اور عظیم طاقت کو راہ خدا میں خرچ کر دیا۔ اور اس جبلّت کی لذت اور حظ سے بہرور ہونے کی بجائے آپ نے اپنی تمام زندگی اس بات کے لئے وقف کر دی کہ گنہگار مردوں اور عورتوں کو توبہ اور الٰہی مغفرت کا پیغام دیں اور خدا کی بادشاہت کی خوشخبری دیں اور اندھوں، لنجوں، کوڑھیوں اور مفلوجوں وغیرہ کو شفا عطا کریں۔ مردوں کو زندہ کریں "قیدیوں کو رہائی دیں۔ کچلے ہوؤں کو آزاد کریں۔ اور خداوند کے سال مقبول کی منادی کریں" (لوقا ۴: ۱۸)۔ آپ نے "آسمان کی بادشاہت کی خاطر اپنے آپ کو خوجہ بنایا" (متی ۱۹: ۱۲)۔ آپ نے کمال ایثار کو کام میں لا کر تمام "عمر اپنی مرضی نہیں بلکہ اپنے بھیجنے والے کی مرضی" پر عمل کیا (یوحنا ۵: ۳۰) اور

فرمایا ”میں آسمان سے اترا ہوں نہ اس لئے کہ اپنی مرضی کے موافق عمل کروں۔ بلکہ اس لئے کہ اپنے بھیجنے والے کی مرضی کے موافق عمل کروں (یوحنا۶:۳۸)۔ منجی عالمین نے خدا کی رضا کو پورا کرنے کے لئے اور اس کی محبت کا ”شہر شہر اور گاؤں گاؤں “(لوقا۸: ۱؛ مرقس۶:۶؛ متی۹: ۳۵ وغیرہ)اعلان کرنے کے لئے اور اپنا جانفزا پیغام دینے کے لئے جبلّت جنسی کے جائز استعمال سے بھی پرہیز فرمایا اور اس جبلّت کی تمام طاقت قوت اور توانائی کو خلق خدا کی خدمت اور رضائے الٰہی کو پورا کرنے میں صرف کر دیا۔ ابن اللہ کو خوب معلوم تھا۔ کہ آپ کی عمر اس دنیا میں چند سال کی ہو گی (لوقا۱۳:۳۱)۔ خدا نے آسمان کی بادشاہت کو دنیا میں قائم کرنے کی مبارک خدمت آپ کے سپرد کی تھی۔ پس آپ نے اپنی ساری عمر کو بے نظیر ایثار نفسی کے ساتھ فی سبیل اللہ وقف کر دیا۔ حتیٰ کہ آپ نے تمام ضروری لذات کو بھی بخوشی ترک کر دیا۔ آپ فرماتے تھے ”میرا کھانا پینا یہ ہے۔ کہ اپنے بھیجنے والے کی مرضی کو بجالاؤں اور اس کام کو پورا کروں“ (یوحنا۴: ۳۴)۔ پس جس شخص کو ایسا بے مثل کام سرانجام دینا ہو اس کو یہ زیبا نہ تھا کہ وہ اپنے بیش بہا آسمانی مقدس اوقات کا معتدبہ (قابلِ اعتماد، بہت سا) حصہ گرہستی کے دھندوں اور جورو کے پھسلانے بچوں کو جنوانے اور خویش واقارب کی خاطر مدارات میں تلف کر دے اور یوں اپنی زندگی کے مقصد اولین کو جس کی خاطر آپ دنیا میں آئے تھے برباد کر دیتے۔ یہ کام آدم کے زمانہ سے لوگ کرتے آتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ مگر جو کام ابن اللہ کرنے آئے تھے۔ وہ پس انہیں کا حصہ تھا۔ پس آپ نے آسمان کی بادشاہت کی خاطر تجرد اختیار فرمایا۔ اور جبلّت جنسی کی عظیم طاقت قوت اور توانائی کو راہ خدا میں خرچ کر دیا۔

(۲)

قرآن شریف نے آپ کے تجرد اختیار کرنے کے نکتہ کو ایک اور لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ قرآن میں اللہ کی ذات کی نسبت آیا ہے۔ لم یلد ولم یولد اور لم یکن لہ صاحبۃ یعنی نہ وہ جنا گیا ہے اور نہ اس کو کسی نے جنا ہے۔ اور نہ اس کی کوئی جورو ہے۔ چونکہ کلمتہ اللہ کو ہر طرح کی مناسبت صرف خدا کے ساتھ ہے لہٰذا دنیاوی اعتبار سے نہ آپ کا کوئی باپ ہو سکتا تھا۔ نہ کوئی اولاد اور نہ کوئی جورو۔

مسیحیت اور رہبانیت

بہر حال تجرّد کے اختیار کرنے میں ابن اللہ نے اپنی جبلّت جنسی کی تمام توانائی اور قوت کو خدا کی بادشاہت کے اعلیٰ ترین مقصد کے حصول میں صرف کر دیا۔ اور ایثار نفسی کا کامل نمونہ بنے (یوحنا۱۲: ۲۴) آپ نے اپنے تجربہ کی بنا پر فرمایا تھا کہ:

”بعض خوجے ایسے ہیں۔ جنہوں نے آسمان کی بادشاہت کی خاطر اپنے آپ کو خوجہ بنایا“ (متی۱۹: ۱۲) جس کا مطلب یہ ہے کہ بعض مبارک اشخاص ایسے بھی ہیں۔ جن کو خدا نے یہ توفیق عطا فرمائی ہے۔ کہ جنسی جبلّت کی زبردست قوت اور عظیم توانائی کو انجیل کی خدمت میں صرف کر دیتے ہیں۔

مقدس پولُس نے بھی جناب مسیح کی خاطر اور انجیل کی تبلیغ کی خاطر جنسی جبلّت کے استعمال سے انکار کیا۔ اور اس کی طاقت کو انجیل کی اشاعت میں صرف کر دیا اور وہ اپنے تجربہ سے یہ کہتے ہیں ”میں تو یہ چاہتا ہوں کہ جیسا میں ہوں ویسے ہی سب آدمی ہوں۔ لیکن ہر ایک کو خدا کی طرف سے خاص

خاص توفیق ملی ہے کسی کو کسی طرح کی۔ کسی کو کسی طرح کی۔ پس میں بے بیاہوں اور بیوہ عورتوں کے حق میں یہ کہتا ہوں۔ کہ ان کے لئے ایسا ہی رہنا اچھا ہے۔ جیسا میں ہوں۔ لیکن اگر ضبط نہ کر سکیں تو بیاہ کر لیں" (۱۔ کرنتھیوں ۷: ۷) منجی عالمین نے بھی یہی فرمایا تھا۔ کہ سب لوگ اس بات کے اہل نہیں کہ جبلّت جنسی کے اقتضا کو پورا نہ کریں اور اس جبلّت کی تمام کی تمام طاقت کو راہ خدا میں خرچ کر دیں آپ کا ارشاد ہے کہ "سب اس بات کو قبول نہیں کر سکتے ہے۔ مگر وہی جن کو یہ قدرت دی گئی ہے جو قبول کر سکتا ہے وہ قبول کرے" (متی ۱۹: ۱۱)۔ پس وہ لوگ سراسر غلطی پر ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ مسیحی تعلیم میں بیاہ کی ممانعت ہے۔ یا اس حالت کو ایک مذموم شے قرار دیا گیا ہے۔ (سورہ حدید آیت ۲۷) کلمتہ اللہ کی تعلیم ازدواج کے رشتہ کی پاکیزگی پر اصرار کرتی ہے (عبرانیوں ۱۳: ۴)۔ ابن اللہ کے رسول ایسی تعلیم کو جو بیاہ کو مذموم قرار دیتی ہے "گمراہ کرنے والی روحوں اور شیاطین کی تعلیم" (۱۔ تیمتھیس ۴: ۱) قرار دیتے ہیں۔

(۲)

مسیحیت رہبانیت کے اصول کی قائل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ اصول مسئلہ تجسم کے منافی ہے اور مسیحیت ابن اللہ کے تجسم کی قائل ہے۔ تجسم کے عقیدہ کی بنیاد ہی یہ ہے۔ کہ ہمارے بدن اور اس کی جبلّتیں بالخصوص جنسی جبلّت اور جنسی تعلقات فی نفسہ بُرے نہیں۔ اس کے برعکس تجسم کے عقیدے کی روشنی میں ہماری جبلّتوں کے تعلقات اور اقتضاہم کو ان کی نہایت پاکیزہ صورت میں نظر آتے ہیں۔ ابن اللہ کے تجسم کے عقیدے کی وجہ سے مسیحیت جنسی جبلّت اور والدینی جبلّت کی پاکیزگی اور خاندانی زندگی کو خوبصورتی پر بے حد اصرار کرتی ہے۔ اور یہ حقیقت ایسی واضح ہے کہ ایڈورڈ کارپینٹر (Edward Carpanter) جیسا کٹر مخالف مسیحیت کو بھی اس کا اعتراف ہے۔

(3)

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ بطور مستثنیٰ بھی کسی شخص کو جنسی تعلقات کے بغیر نہیں رہنا چاہیے۔ ان معترضین کے خیال میں ہر بالغ مرد کی صحت اور تندرستی کے لئے لازم ہے۔ کہ وہ جنسی جبلّت کو استعمال کرے۔ اور جنسی تعلقات سے بہرہ ور ہو۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط اور صداقت سے دور ہے۔ چنانچہ برطانیہ کی سوشل ہائی جین کونسل (British Social Hygienc Council) نے اپنے بیان مورخہ ۲۲ مارچ 1936ء میں یہ شائع کیا ہے کہ

> "ہم کو نہ تو علم الاجسام (Physiology) یہ بتاتا ہے۔ اور نہ یہ بات ہمارے تجربہ میں آئی ہے کہ مجرد اشخاص کی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے جنسی تعلقات سے بہرہ ور ہونا لازم ہے۔ علاوہ ازیں نہ تو علم نفسیات (Psychology) ہم کو یہ بتلاتا ہے اور نہ یہ بات ہمارے تجربہ میں آئی ہے کہ مجرد اشخاص کی ذہنی صحت کو قائم رکھنے کے لئے جنسی تعلقات سے بہرہ ور ہونا لازم ہے"

(منقول از جرنل آف سوشل ہائی جین بابت دسمبر 1927ء)

پس اگر کوئی مسیحی اپنی تمام زندگی کسی خاص مقصد کی خاطر وقف کر دینا چاہے۔ اور اس مقصد پر وہ اپنے جنسی تعلقات تک کو بھی قربان کر دے تو وہ اپنی فطرت پر کسی قسم کا جبر روا نہیں رکھتا پروردگار عالم نے یہ توفیق ہر ایک کو عطا نہیں کی۔ لیکن جن کو یہ توفیق ملی ہے۔ اگر وہ جنسی تعلقات سے قطعاً پرہیز کرتے ہیں تو وہ نہ خلافِ فطرت فعل کرتے ہیں اور نہ فطرت پر کسی قسم کا تشدد کرتے ہیں۔

(4)

پس انجیل جلیل کی صریح اور واضح تعلیم یہ ہے۔ کہ جبلّت جنسی کے واجب اور جائز استعمال کے لئے "ہر مرد اپنی بیوی اور ہر عورت اپنا شوہر رکھے"۔ ازدواج کے رشتہ کے قیام اور پائداری کی خاطر طلاق کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ جبلّت جنسی کے ناواجب شدت اور تکرار عمل کو رفع کرنے کے لئے تعداد ازدواج کو حرام گردانا گیا ہے۔ اگر کسی شخص کو خالق کی طرف سے یہ توفیق عطا کی گئی ہے کہ وہ جبلّت جنسی کے اقتضا کو پورا کرنے کی بجائے اس کی تمام طاقت قوت اور توانائی کو کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کی جانب موڑ دے تو بطور استثنیٰ کے ایسے شخص کو قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ انسان محض جسم نہیں جس کے پنجرہ میں خالق نے ایک روح کو مقید کر دیا ہے۔ تاکہ وہ جسم کی خواہشات کو پورا کرے بلکہ وہ ایک روح ہے۔ اور اس کی روح کو قدرت نے ایک جسم عنایت کیا ہے تاکہ وہ اس جسم کے ذریعہ اعلیٰ ترین روحانی مقاصد کو حاصل کر سکے۔ انسان شادی بیاہ کی خاطر خلق نہیں کیا گیا۔ بلکہ بیاہ انسان کے اقتضا کو پورا کرنے کے لئے ہے۔ بعض اشخاص کو یہ توفیق بخشی گئی ہے۔ کہ وہ اس جبلّت کا استعمال نہ کریں۔ لیکن جن لوگوں کو خدا کی طرف سے یہ توفیق نہیں بخشی گئی۔ مسیحی تعلیم کے مطابق ایسے اشخاص خواہ وہ مرد ہوں خواہ عورت جبلّت جنسی کا معتدل طور پر استعمال کر کے اس کی وافر قوت اور فاضل طاقت کو خدا کی راہ میں اپنی روحانی ترقی اور بنی نوع انسان کی فلاح اور بہبود کے ذرائع مہیا کرنے میں صرف کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انجیل جلیل میں شوہر اور بیوی کو یہ صلاح دی گئی ہے کہ "تم ایک دوسرے سے جدا نہ رہو۔ مگر تھوڑی مدت تک آپس کی رضامندی سے تاکہ دعا میں مشغول رہ سکو اور اس مدت کے بعد پھر جدا نہ رہو۔ مبادا غلبہ نفس کے سبب شیطان تم کو آزمائے" (۱۔ کرنتھیوں ۷: ۵)۔

ہر شخص جنسی جبلّت کی مندرجہ بالا خصوصیات کا مقابلہ مسیحی تعلیم کے ساتھ کر کے خود دیکھ سکتا ہے کہ جہاں تک اس جبلّت کا تعلق ہے مسیحیت کی تعلیم عین اس جبلّت کی فطرت اور اقتضا کے مطابق ہے۔

جنسی جبلّت اور اسلام

جنسی جبلّت کی خصوصیات کا ذکر کرتے وقت ہم نے دیکھا تھا کہ وحدتِ ازدواج اس جبلّت کے اقتضائے کے لئے نہایت لازمی ہے اور لابدی امر ہے۔ اور نیز یہ کہ ازدواجی تعلقات کا قیام، استحکام، پائداری اور استواری اور طلاق کی ممانعت جبلّت جنسی کے لئے نہ صرف ضروری ہے بلکہ اس کی لازمی شرائط ہیں۔ یہ امر بیان کا محتاج نہیں کہ مسیحیت کے برعکس قرآن کی تعلیم تعدادازدواج کی اجازت دیتی ہے اور طلاق کو ممنوح قرار نہیں دیتی۔ چنانچہ قرآن میں لکھا ہے کہ "عورتوں میں سے جو تم کو پسند آئیں۔ دو دو، تین تین اور چار چار نکاح میں لاؤ اور اگر یہ خوف ہو کہ عدل قائم نہ رکھ سکو گے تو

ایک ہی نکاح کرو۔ یا وہ (باندی) جو تمہارے ہاتھوں کا مال ہو ۔۔۔شوہر والی عورتوں کا نکاح میں لانا حرام ہے۔ سوائے ان (باندیوں) کے جو تمہارے ہاتھ کی ملکیت ہو جائیں۔۔۔۔ان کے سوا سب عورتیں تم کو حلال ہیں۔ جن کو تم اپنا مال دے کر طلب کرو۔ اور ان عورتوں میں جس سے تم نے فائدہ اٹھایا۔ ان کی اجرت دے دو۔ جو تم نے (فائدہ اٹھانے سے پہلے ان کے ساتھ) مقرر کی تھی (سورہ نساء ع ا تا 4)۔ "جو اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرتے ہیں۔ مگر اپنی بیویوں پر یا اپنے ہاتھ کے مال (یعنی لونڈیوں باندیوں) سے۔ اس میں ان پر کچھ الزام نہیں" (مومنوں آیت 5)۔ پس ان قرآنی آیات کے مطابق اگر کوئی شخص چاہے تو وہ چار منکوحہ عورتیں اور لاتعداد غیر منکوحہ لونڈیاں رکھ سکتا ہے۔ مزید برآں (سورہ نساء) مندرجہ بالا آیات کے مطابق متعہ بھی حلال اور مشروع ہے۔ جس کے مطابق مسلمان عورتوں کو اجرت دے کر وقت معینہ کے لئے ان سے "فائدہ اٹھا" سکتے ہیں (سورہ نسا آیت ۲۸) علاوہ ازیں چونکہ قرآن منکوحہ عورتوں کو طلاق دینے کی اجازت دیتا ہے (بقر ع ۲۶ وغیرہ) پس قرآن کی تعلیم کا عدول کئے بغیر اور چار منکوحہ بیویوں کی حد سے تجاوز کئے بغیر ایک مسلمان لاتعداد عورتوں سے یکے بعد دیگرے نکاح پر نکاح کر سکتا ہے۔ اور ان کو طلاق پر طلاق دے سکتا ہے۔ کیونکہ قرآن کے مطابق "عورتیں تمہارا کھیت ہیں۔ سو تم اپنے کھیت میں جیسے چاہو جاؤ" (بقر آیت ۲۲۳)۔

(۲)

اب غبی (کم عقل) سے غبی شخص پر بھی ظاہر ہے کہ قرآنی تعلیم جنسی جبلّت کے اقتضاؤں کو پورا نہیں کر سکتی۔ اور نہ وہ ازدواجی تعلقات کو پائیدار یا مستحکم کر سکتی ہے۔ اس کے برعکس کثرت ازدواجی کی تعلیم عورتوں کے مستقبل کو تاریک کر دیتی ہے۔ بچوں کے نشوونما، تعلیم اور ترقی کے حق میں زہر قاتل کا حکم رکھتی ہے۔ ازدواج کے رشتہ اور خاندان کے قواعد میں خلل اور بدنظمی پیدا کرتی ہے۔ اور اس باہمی اخلاص اور وفاداری کے کلیتہً منافی ہے۔ جس کی وجہ سے والدینی جبلّت اور جبلّت جنسی کے تعلقات مدت العمر پائیدار رہتے ہیں۔ تعداد ازدواج جبلّت جنسی کو غیر معتدل طور برانگیختہ کرتی ہے اور مرد و زن کے رشتہ کی پاکیزگی کے منافی ہے۔

(3)

بعض مسلم برادران وحدتِ ازدواج کو انسان کے لئے غیر فطرتی حالت قرار دیتے ہیں۔ اور اس کے ثبوت میں یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ انسان اپنی ترقی کے ابتدائی مراحل و منازل میں وحدت ازدواج پر اکتفا نہیں کرتا۔ لیکن اول یہ بات سرے سے غلط ہے، کہ انسانی معاشرت کے ابتدائی مراحل میں مردوں اور عورتوں کے تعلقات گویا مرغا اور مرغیوں کے سے ہوتے ہیں۔

چنانچہ علم الانسان کا ماہر ڈاکٹر مالنوسکی (Dr. Malinouskis) (جو کسی طرح بھی مسیحیت کا خیر خواہ کہلایا نہیں جاسکتا) اس نظریہ کو مردود قرار دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ

"یہ حقیقت پر مبنی نہیں"۔

95)ا(Sesc and Repression in Savage Society p.

دوم بفرض محال اگر یہ درست بھی ہو تاہم کوئی صحیح العقل شخص وحشیانہ زندگی کو انسانی ترقی اور تہذیب کا معیار قرار نہیں دے گا۔ اور نہ کوئی روشن خیال شخص زندگی کے ابتدائی مراحل کے حالات کو انتہائی منازل کا نصب العین قرار دے گا۔

(4)

تعداد ازدواج یہ موقعہ نہیں دیتی کہ جبلّت جنسی کی وافر قوت اور فاضل طاقت کو ایسے مقاصد اور اغراض کے حاصل کرنے میں صرف کیا جاسکے۔ جن سے انسان کی روحانی ترقی اور بنی آدم کی بہبودی مقصود ہے۔ حالانکہ جیسا کہ سطور بالا میں مفصل طور پر ذکر ہو چکا ہے۔ یہ جبلّت دیگر تمام جبلّتوں سے زیادہ مختلف وجدانیات اور اقتضاؤں کو اپنی عظیم توانائی مستعار دیتی ہے۔ پس نتیجہ ظاہر ہے کہ جہاں تک جبلّت جنسی کا تعلق ہے۔ اسلام کسی طرح بھی دین فطرت کہلانے کا مستحق نہیں۔

قرآن اور تعدد ازدواج

تعداد ازدواج کے متعلق قرآنی تعلیم ایسی واضح اور صریح ہے۔ اور اس کے بد نتائج بنی نوع انسان کے لئے ایسے ضرر رساں ثابت ہوئے ہیں۔ کہ مصلحین اسلام کو اس معاملہ میں بے اندازہ دقتوں (مشکلات) کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات ان کو راہ فرار یہ سوجھتی ہے کہ قرآنی تعلیم کا سرے سے انکار کر دیا جائے۔ مثلاً جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ نکاح متعہ اور رنڈی بازی میں فرق نہیں۔ تو وہ اس قسم کے نکاح کے جواز کا سرے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اسلامی شرع میں جو یہ نکاح حرام ہے۔ لیکن (سورہ نساء کی آیت بست وہشتم) اس نکاح پر نص صریح (قرآن پاک کی وہ آئتیں جو صاف اور صریح ہوں) ہے۔ اسلامی مصلحین کہتے ہیں کہ حدیث میں رسول ﷺ نے اس نکاح کو حرام قرار دے دیا ہے۔ لیکن اول کوئی حدیث قرآنی احکام کو منسوخ نہیں کر سکتی۔ قرآن نے متعہ کو حلال قرار دیا ہے۔ اور قرآن کی کسی آیت نے اس کے جواز کو منسوخ نہیں کیا۔ پس قرآن کے مطابق متعہ حلال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عبداللہ بن مسعود سا قرآن دان جس کو خود رسول عربی نے قرآن کا مسلم الثبوت استاد گردانا تھا۔ متعہ کے جواز پر اصرار کرتا تھا۔ دوم اگر فی الحقیقت حرمت متعہ والی حدیث صحیح حدیث ہے اور رسول عربی نے اپنی حین حیات میں متعہ کو حرام قرار دے دیا تھا تو خلیفہ اول کے عہد میں متعہ کس طرح حلال اور مروج ہو گیا۔ کیونکہ خلیفہ عمر نے اپنی خلافت کے نصف عہد میں جا کر اس کو حکماً بند کیا تھا۔ خلیفہ مامون نے متعہ کو دوبارہ جاری کیسے کر دیا؟ حقیقت تو یہ ہے کہ متعہ کے جواز کا انکار کرنا در حقیقت قرآن اور تاریخ اسلام کا انکار کرنا ہے۔

(۲)

جب بیسویں (۲۰) صدی کے اسلامی مصلحین کے لئے انکار کی راہ فرار مسدود (بند) ہو جاتی ہے تو وہ قرآن کی آیات کی تاویلیں کرنی شروع کر دیتے ہیں۔ تاکہ کسی نہ کسی طرح تعداد ازدواج اور طلاق کے بد نما دھبوں کو اسلام کے چہرے پر سے مٹا سکیں۔ مبادا بیسویں (۲۰) صدی کے تعلیم یافتہ روشن

خیال مسلمان اسلام کو ایسی تعلیم کی وجہ سے خیر باد نہ کہہ دیں۔ چنانچہ وہ اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ قرآنی آیات کی اس طرح تاویل کریں۔ کہ قرآن بیسویں صدی کے خیالات کا مجموعہ ہو جائے۔ وہ قرآن کے منہ سے وہ باتیں کہلوانا چاہتے ہیں جن کو وہ خود ماننا چاہتے ہیں۔ چنانچہ سید امیر علی صاحب مرحوم (سورہ نساء) کی کثرت ازدواج والی آیت کی یوں تفسیر کرتے ہیں

> "شارع اسلام نے ازدواج کی ایک تعداد مقرر کر دی۔ اور ازدواج کے مواجب و حقوق ان کے شوہروں پر معین کر دیئے اور شوہر پر فرض عین کر دیا کہ سب ازدواج سے من جمیع الوجوہ برابر برتاؤ رکھے۔۔۔۔ تعداد ازدواج میں عدل کی ایک ایسی قید لگادی ہے جس سے یہ فعل صرف محدود ہی نہیں ہو گیا ہے۔ بلکہ جس آیت سے اذن مفہوم ہوتا ہے اس آیت کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ کہ کوئی شخص ایک سے زیادہ زوجہ نہ کرے"۔

(Syed Amir Ali's Spirit of Islam)

اب ظاہر ہے کہ قرآن چار عورتوں کو بشرط عدل جائز بتاتا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ "تم ہر گز عدل نہ کر سکو گے۔ عورتوں میں اگرچہ اس کا شوق کرو" (نساء ۱۲۹)۔ بس یا تو یہاں بخیال سید مرحوم تعداد ازدواج حرام ہوا۔ کیونکہ عدل ناممکن ہے۔ اور تمام مومن مسلمان جو چودہ سو (۱۴۰۰) سال سے ایک سے زیادہ نکاح کرتے آئے ہیں۔ موافق اس تاویل کے نعوذ باللہ حرامکاری اور نواہی (ناجائز امور) کے مرتکب ہوئے۔ یا یہ قول باطل ہے۔ کہ تم "عورتوں میں ہر گز عدل نہ کر سکو گے" اور اگر یہ دونوں درست ہیں تو "عدل" سے مراد چاروں عورتوں میں مساوات کا رکھنا۔ چاروں سے برابر الفت اور محبت وغیرہ کرنا نہیں ہے۔ بلکہ "عدل" سے مراد کچھ اور ہی ہے۔ جس کا عمل میں لانا ہر گز دشوار نہیں۔ قرآن مجید خود ہم کو بتاتا ہے کہ اس کی مراد "عدل" سے کیا ہے۔ عدل سے مراد صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ ہے "سو نرے پھر بھی ایک کی طرف ہی نہ جھک جاؤ اور ایک کو ادھڑ میں لٹکتا نہ چھوڑ دو" (نساء ۱۲۸) یعنی جب کوئی مسلمان ایک سے زیادہ عورتوں سے بیاہ کرے تو قرآن صرف "یہ عدل" طلب کرتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو بالکل رانڈ کی طرح نہ ڈال رکھے۔

مولوی محمد علی ایم صاحب ایم۔ اے امیر جماعت احمدیہ لاہور ہماری اس تنقیح اور تنقید کے ساتھ متفق ہیں۔ چنانچہ آپ عدل کی شرط کی نسبت فرماتے ہیں کہ

> "ان الفاظ سے بعض لوگوں نے یہ غلطی بھی کھائی ہے۔ کہ یہاں (نساء آیت 3) عدل کی شرط رکھ کر اور دوسری جگہ (نساء آیت ۱۲۸) عدل کو انسانی استطاعت (طاقت) سے باہر قرار دے کر تعلیق (ایک چیز کو دوسری چیز کے متعلق کرنا) بالمحال کر دی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ شریعت میں ایک امر کی اجازت دینا اور پھر اس کو ایک محال امر کے ساتھ مشروط کرنا قرآن جیسی حکیم کتاب کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا۔ اگر یہی منشا تھا۔ تو صاف یہی فرما دیا ہوتا کہ تعداد ازدواج کی تم کو اجازت ہی نہیں۔ یہ باتیں محض یورپ کی تقلید نے کہلوائی ہیں"

(بیان القرآن جلد اول صفحہ 458 نوٹ 604)

پھر مولوی صاحب موصوف کہتے ہیں

"یہ خیال کہ تعداد ازدواج کی اجازت دے کر پھر اسے ایک محال شرط سے وابستہ کر دیا ہے اور خود ہی شرط کو محال قرار دے دیا ہے۔ صحیح نہیں۔۔۔۔ خدا کے کلام کو یہ شایاں نہیں کہ خود ایک ضرورت کو بیان کرے پھر خود ہی اس کے پورا کرنے کو ایک محال شرط سے وابستہ کر دے۔ اگر ضرورت تعداد ازدواج کی ہے۔ تو پھر اس کا انکار اس بناء پر نہیں ہو سکتا۔ کہ تم عدل نہیں کر سکتے۔ کیا یہ خود خدا تعالیٰ پر اعتراض نہیں کہ ایک طرف تعداد ازدواج کی ضرورت کو بیان کرتا ہے اور دوسری طرف تعداد ازدواج کو ایک محال شرط سے وابستہ کرتا ہے۔ اس آیت کے معنی صاف ہیں کہ عدل ظاہری کا حکم تو ہم دے چکے۔ محبت میں مساوات کے لئے ہم (خدا) تم کو مجبور نہیں کرتے ۔ہاں ایک عورت کی طرف اس قدر بے رغبتی کرنا کہ وہ نہ خاوند والیوں میں داخل ہو نہ بغیر خاوند والیوں میں۔ ادھڑ میں لٹکتی ہوئی ہو۔ اس سے منع فرمایا"

(ایضاً صفحہ 566 نوٹ 743)

یقیناً اگر اس دنیا میں کوئی شخص گزرا ہے۔ جو قرآنی آیات کے حقیقی مفہوم سے واقف تھا۔ تو وہ رسول عربی تھے۔ پس آپ کے اقوال وافعال قرآنی آیات کی بہترین توضیح تشریح اور تفسیر ہیں۔ اگر سید امیر علی صاحب مرحوم کا قول درست ہے۔ اور تعداد ازدواج کی اسلام میں فی الحقیقت اجازت نہیں۔ تو آنحضرت ضرور اس حکم ربانی پر عمل کرتے (سورہ انعام 106) لیکن آپ نے بیک وقت ایک سے زیادہ ازدواج سے نکاح کیا۔ پس ثابت ہوا کہ قرآن کا منشا ہرگز یہ نہ تھا کہ مومنین ایک ہی زوجہ پر قناعت کریں۔ پس اس نے چار کی اجازت دے دی۔ اور آنحضرت کو چار کی قید سے مستثنیٰ کر کے اس روشن حقیقت پر مہر ثبت کر دی کہ قرآن کا حقیقی منشا یہ ہے کہ اسلام میں تعداد ازدواج کی رسم مروج رہے۔ چنانچہ قرآن میں آیا ہے کہ "اے نبی ہم نے تیرے لئے تیری وہ عورتیں حلال کر دی ہیں۔ جن کا مہر تو دے چکا ہے۔ اور وہ لونڈیاں بھی جو تیرے ہاتھ کا مال ہیں جو خدا نے تیرے ہاتھ لگوا دیا ہے۔ اور تیرے چچا کی بیٹیاں اور تیرے ماموں کی بیٹیاں اور تیری خالاؤں کی بیٹیاں جنہوں نے تیرے ساتھ ہجرت کی ہے" (احزاب 49)۔

علاوہ ان عورتوں اور باندیوں کے اللہ نے حضرت رسول عربی کے ساتھ یہ رعایت ملحوظ رکھی۔ جو آپ کی ذات خاص تک محدود تھی۔ کہ آپ کے لئے وہ "مومن عورت بھی حلال ہے۔ جو اپنی جان نبی کو بخش دے۔ اگر نبی اس کو نکاح میں لینا چاہے یہ خاص تیرے ہی لئے ہے نہ اور ایمانداروں کے لئے۔ تاکہ تیرے اوپر تنگی نہ رہے" (احزاب 49 تا 50)۔

عدل کے قرآنی اصول کا صحیح مفہوم بھی اس قرآنی آیت سے واضح ہے "ان عورتوں میں سے جس کو تو چاہے علیحدہ کر دے۔ اور جس کو چاہے تو اس کو اپنے پاس جگہ دے۔ اور جن کو تو نے علیحدہ کر دیا تھا۔ اگر ان میں سے تو کسی کی خواہش کرے۔ تو تجھ پر گناہ نہیں۔ یہ اجازت اس کے زیادہ قریب ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور غم نہ کریں۔ اور سب اس پر جو تو نے ان کو دیا راضی رہیں" (احزاب 51)۔

پس یہ آیت بموجب اصول "معنی قرآن ز قرآن پرس وبس" اس تفسیر کی تائید کرتی ہے۔ جو ہم اصول عدل کے متعلق سطور بالا میں کی ہے۔ اور جس کی تصدیق امیر جماعت احمدیہ لاہور نے اپنی کتاب "بیان القرآن" میں کی ہے۔

پس ثابت ہو گیا کہ قرآن اور شارع (شریعت) اسلام کا حقیقی منشا یہی تھا کہ اگر کوئی شخص چاہے تو چار عورتوں تک نکاح کر سکتا ہے اور لاتعداد لونڈیاں اور کنیزیں رکھ سکتا ہے۔ اور چونکہ طلاق جائز ہے لہٰذا اسلام میں در حقیقت منکوحہ عورتوں کی تعداد کی کوئی حد مقرر نہیں ہو سکتی۔ اور لونڈیوں کی تعداد تو پہلے ہی محدود نہ تھی۔ چونکہ لونڈیاں باندیاں بھی عورتوں کی جماعت میں شامل ہیں اور نکاح متعہ بھی قرآن کے مطابق حلال ہے لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام میں عورتوں سے فائدہ اٹھانے کی در حقیقت کوئی حد ہے نہیں۔

جبلّت جنسی اور اسلامی ممالک کی تاریخ

ہم نے جنسی جبلّت کی خصوصیت میں دیکھا تھا۔ کہ اس جبلّت کے لازم ہے کہ وہ وحدت ازدواج کے قانون کی جانب سے لاپرواہی اختیار نہ کی جائے۔ بلکہ اس رشتہ کے قیام وبقا پر زور دیا جائے تاکہ طلاق کے رواج کی گنجائش نہ رہے۔ اور مرد وزن میں وفاداری اور باہمی اخلاص کے تعلقات مدت العمر پائدار اور استوار رہ سکیں۔ ہم نے یہ بھی ذکر کیا تھا کہ جن اقوام میں وحدت ازدواج کی بجائے کثرت ازدواج رائج ہے اور رشتہ ازدواجی کی طرف سے بے پرواہی اختیار کی جاتی ہے اور طلاق کی اجازت اور کثرت مروج ہو جاتی ہے ان اقوام میں زوال پیدا ہو جاتا ہے۔

اسلام کی تاریخ پر ایک اجمالی نظر ڈالو تو مذکورہ بالا حقیقت کا ایک ایک حرف اس پر صادق آتا ہے۔ گویا اسلامی ممالک اس حقیقت کی زندہ مثالیں ہیں۔ جس جس ملک کو اسلام نے فتح کیا اور وہاں اسلامی تعلیم کے مطابق کثرت ازدواج اور طلاق مروج ہو گئے۔ اس ملک میں زوال اور انحطاط کے بیج بوئے گئے۔ اس تعلیم کی بدولت ان کا اخلاقی معیار گر گیا ان کی قومی قوت اور طاقت کمزور ہو گئی۔ چنانچہ مشہور مسلمان مورخ مرحوم ایس خدا بخش مرحوم اپنی کتاب "ہندی اور اسلامی مضامین" (Indian & Islamic Essays) میں یوں رقمطراز ہیں۔

> "تعداد ازدواج نے اسلامی ممالک کی سلطنتوں کو کھوکھلا کر دیا۔ عورتوں اور باندیوں کی تعداد کی وجہ سے مسلمان بادشاہوں کے بال بچوں کی تعداد روز افزوں ہوتی ہو گئی۔ مثلاً جب عباسیہ خاندان بر سر اقتدار تھا۔ تو ان خلفاء کے بچوں کی تعداد بے شمار تھی۔ خلیفہ ماموں کے وقت میں اس خاندان کے افراد کی تعداد 33000 ہزار تھی۔ تعداد ازدواج اور باندیوں کے وجود کا اثر مسلمانوں کی حکومت کے اقتصادی اور سیاسی حالات کے حق میں بہت

مضر ثابت ہوا۔ اس کی وجہ سے نسل کی شرافت اور نجابت (شرافت، عالی خاندان) میں خلل واقع ہو گیا۔ اور ایسے کمینہ، نالائق اور ناخلف بچوں کی تعداد میں افزائش کا شمہ تک نہ تھا۔ تعداد ازدواج نے خاندانی زندگی کو تباہ اور برباد کر دیا۔ اور حق تو یہ ہے کہ یہی بات بدترین نتائج کے وقوع میں آنے کی ذمہ وار تھی۔ درحقیقت تمام اسلامی سلطنتوں کے زوال کا باعث ہی یہی ہوئی۔ اس نے مسلمانوں کی اخلاقی قوت کو پائمال کر دیا۔ ان بے شمار افراد کی زندگیوں پر غور کرو جو حرم سراؤں میں رہتے تھے۔ مختلف عورتیں اپنے لڑکوں، لڑکیوں اور دیگر عزیز واقارب کے ساتھ ایک ہی جگہ رہتی تھیں۔ لیکن ان میں سے ہر ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اس زہریلی فضا میں ان عورتوں کے لڑکے اور لڑکیاں پرورش پاتی تھیں۔ ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کے نازک اور ناتجربہ کار ذہنوں اور دماغوں پر اس فضا کا کیا اثر پڑتا ہو گا۔ ہر لڑکا اپنے ہر دوسرے رشتہ دار بلکہ بھائی تک کو شک کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ اگر ایک تخت نشین ہو جاتا تو باقی اس کے خون کے پیاسے ہو جاتے اور اس کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔ تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ تعداد ازدواج اسلامی سلطنتوں کی باہمی آویزش، خانہ جنگی، پرخاش، فساد، جنگ وجدل اور قتال کا اصلی سبب ہے"

(صفحہ 93تا95)

(۲)

جب تک ترک اسلامی تعلیم تعداد ازدواج اور قرآنی احکام طلاق کے پیرو رہے۔ وہ براعظم یورپ میں "مرد بیمار" کے نام سے موسوم رہے۔ لیکن جہاں ترکی نے اس تعلیم سے روگردانی اختیار کی وہ شاہراہ ترقی پر گامزن ہو گئی۔ چنانچہ اب ترکی میں تعداد ازدواج قانوناً جرم قرار دے دیا گیا ہے۔ اس کی تعزیرات کی دفعہ ۱۱۲ میں ہے۔ کہ "اگر کسی نکاح کے وقت خاوند یا بیوی پہلے سے حبالہ عقد (شادی کے پھندے) میں آ چکے ہوں۔ تو ایسا نکاح منسوخ ہو گا" پھر دفعہ ۱۲9 میں ہے۔ کہ "خاوند اور بیوی دونوں اس حالت میں طلاق کے جویاں (خواہش مند) ہو سکتے ہیں۔ جب ان میں سے کسی نے زنا کا ارتکاب کیا ہو" اب ترکی میں اسلامی شریعت کی بجائے دیوانی معاملات میں سویٹزرلینڈ کی تعزیرات اور فوجداری معاملات میں اٹلی کی تعزیرات اور تجارتی معاملات میں جرمنی کے آئین مقرر ہو گئے ہیں۔ چنانچہ صبیحہ زکریا خانم لکھتی ہیں۔

"مشرق کی پرانی تہذیب کے مطابق عورتیں اثاث البیت خیال کی جاتی تھیں۔ لیکن سوئٹزرلینڈ کے قوانین اختیار کرنے کی طفیل ہم نے اس ذہنیت کو خیرباد کہہ دیا ہے"۔

(Resimli Ay Sept 7 ۱۹۲۹) ترکی اخبارات لکھتے ہیں

"تیس سال ہوئے عورت کا یہ حال تھا۔ کہ وہ ایک غلام تھی۔ خوف اور شرم اور جہالت کے مارے مردوں کے سامنے خائف لرزاں وترساں رہتی تھی۔ عورت کی زندگی کا نصب العین مرد کو خوش کرنا تھا۔ اس کی تمام اُمیدوں کی انتہا بہشت تھی۔ جو اس کے خاوند کے قدموں میں تھی۔ عورت کا درجہ یہ تھا۔ کہ وہ خرید اور فروخت کی جاسکتی تھی۔ وہ ایک حیوان تھی جو بچوں کے پیدا ہونے کی آلہ کار تھی۔ وہ ایک کھلونا تھی جس سے مرد بوقت ضرورت کھیلا کرتے تھے۔ دس سال ہوئے وہ ایک مجرم کی طرف ہر وقت خائف رہتی تھی۔ اس شش وپنج میں رہتی تھی۔ کہ وہ اپنا برقعہ اٹھائے یا نہ اٹھائے۔ شیخ الاسلام اس کے تن کے کپڑے کی لمبائی اور چوڑائی کا فیصلہ کیا کرتا تھا۔ لیکن اب قانون نے مرد اور عورت کی تمیز اڑادی ہے۔ وہ اب کنیز نہیں رہی جو خرید و فروخت ہو سکے۔ وہ خاندان میں اور قوم میں ایک آزاد خود مختار فرد کے طور پر زندگی بسر کر سکتی ہے۔ اب مرد جاننے لگے گئے ہیں کہ عورتیں ان کی رفیق اور مونس ہیں اور مردوں اور عورتوں کے حقوق مساوی ہیں"۔

(اقدام بابت 16 اپریل 1929ء وملیت 5 مئی 1929ء)

پس ترکی میں عورتیں حرم سرائے سے باہر نکل آئیں ہیں۔ اور اب ترکی میں تعداد ازدواج، طلاق، حرم سراؤں کی قید۔ پردہ کی پابندیاں خوجوں کی فوج وغیرہ زمانہ ماضی کی باتیں ہیں۔ جو ایک ڈروانے خواب کی طرح شب کی تاریکی کے ساتھ گزر گئی ہیں۔

(3)

ترکی کے انقلاب نے دیگر اسلامی ممالک کی آنکھوں کو کھول دیا ہے۔ مصر میں مرحوم قاسم امین بے نے قرآنی تعلیم درباره عورات کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ وہ لکھتا ہے

"اگر مصری چاہتے ہیں کہ ان کی حالت سدھر جائے تو لازم ہے کہ وہ اپنی حالت کو ابتدائی منازل سے سدھاریں۔ ان کو اس بات کا یقین کر لینا چاہیے کہ کوئی زندہ قوم دیگر مہذب اقوام کے ہمدوش (برابر کا) ہو کر نہیں چل سکتی تاوقتیکہ ان کے گھر اور ان کے خاندان ایسے اشخاص کی تربیت کے مرکز نہ بن جائیں جن سے کامیابی کی امید کی جاسکتی ہے۔ لیکن ان کے گھر اور خاندان تربیت کے مرکز نہیں بن سکتے۔ تاوقتیکہ ان کی عورتیں تعلیم حاصل کر کے اپنے خاوندوں کے خیالات کی اور ان کی امیدوں کی اور ان کے دکھ درد اور رنج کی شریک زندگی نہ ہوں۔ مرد اپنے گھر کا مالک ہوتا ہے۔ لیکن عورت اس کی غلام ہوتی ہے۔ وہ ایک کھلونا تصور کی جاتی ہے۔ جس سے مرد جب چاہے اپنا دل خوش کر لے۔ علم اور دانش مرد کے لئے ہے لیکن جہالت اور تاریکی عورت کا حصہ ہے۔ آسمان دنیا اور روشنی مرد کے لئے ہے، لیکن پردہ زندان (قید خانہ) اور تاریکی عورت کا حصہ ہے"۔

(Quoted by Zwemer in Disintepration of Islam)

میڈم رشدی پاشا نے اپنی کتابوں کے ذریعہ اور وزیر تعلیم کے انسپکٹر کی بیٹی نے "اخبار الجریدہ" کے ذریعہ کثرت ازدواج، پردہ۔ صغر سنی کی شادی وغیرہ کے خلاف عورتوں کی طرف سے صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ منصور فہمی نے فرنچ زبان میں ایک کتاب لکھی ہے۔

(A Condition de la femme dams la iraistion et evolntorn de la islamisma)

جس میں تعداد ازدواج پر اور اس قبیح حکم کے ماخذ پر اور ابتدائی اسلام میں زیادہ بیویاں کرنے والوں عورتوں پر اعتراض کیا گیا ہے۔ یہ مصنف اسلامی ممالک کی عورتوں کی پست حالت کے اسباب کو اسلامی تاریخ کی روشنی میں بیان کر کے اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ

"اس میں کچھ شک نہیں کہ اسلامی علم اور ادب اور لٹریچر نے اپنی تاریخ میں عورتوں کا درجہ روز بروز گرادیا اور یوں اسلامی لٹریچر کی حالت گر گئی"۔

اس نتیجہ کی تائید میں وہ امام غزالی اور سیوطی کی تصنفیات سے اقتباس پیش کر کے کہتا ہے۔ کہ

"عورتوں کے متعلق ان علماء کے خیالات اس قدر گرے ہوئے ہیں کہ وہ نا قابل ذکر ہیں"

(Disinterption of Islam)1924ء میں مصر کی شہزادی نے مصری عورتوں کی حالت کو سدھارنے کی خاطر ایک انجمن قائم کی اور اب جابجا عورتوں کی کلب، سوسائیٹیاں اور انجمنیں قائم ہیں۔ ان کی اخباریں عورتوں کے حقوق کی طلبگار ہیں۔ ان انجمنوں کی ممبر ملک کی خدمت اور عورتوں کی بہتری کی حلف اٹھاتی ہیں۔ ان عورتوں نے مصر کے وزیر اعظم کے سامنے نو مطالبات پیش کئے۔ جن میں سے بعض یہ ہیں کہ عورتوں کو آدمیوں کے برابر حقوق ملیں۔ ہائی سکولوں میں لڑکوں کی طرح لڑکیوں کو بھی برابر موقعے دیئے جائیں۔ شادیوں کے دستورات میں اور نکاح کے قوانین میں اصلاح کی جائے۔ شادی کے لئے لڑکی کی عمر قانوناً بڑھادی جائے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ملک مصر نے بھی اسلامی قوانین ازدواج وطلاق کی نظر ثانی کی ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء میں مصر میں ایک نیا قانون بنایا گیا۔ جس کی رُو سے صرف وہی شخص نکاح ثانی کر سکتا ہے جو یہ ثابت کر سکے کہ وہ اپنی پہلی زوجہ اور اس کے بال بچوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا۔ اس قانون کے مطابق بیوی کو بھی طلاق لینے کا حق حاصل ہو گیا ہے۔ مصر کی عورتیں اس امر پر مُصر (اصرار کرنے والی) ہیں کہ نکاح ثانی کی اجازت صرف اس حالت میں ملنی چاہیے جب کہ پہلی بیوی دائم المریض ہو۔ یا اس سے کوئی بچہ نہ ہو۔ ان کے مقابلہ میں جامعہ الازہر کے اسلامی علماء قرآن وحدیث وسنت پیش کرتے ہیں۔ لیکن وہ جواب میں پوچھتی ہیں کہ کیا قرآن آدمیوں کی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے اس بات کا حامی ہے۔ کہ خاندانوں میں آئے دن جھگڑا، فساد، جوتی پیزار اور جنگ وجدل برپا رہے۔ عورتوں کی زندگی دوبھر ہو جائے۔ اور بچوں کی نشوونما اور ترقی میں خلل آئے؟

(مسلم ورلڈ بابت جنوری ۱۹۲۸ء)

(4)

تاریخ ایران میں 1931ء ایک تاریخی سال ہے۔ کیونکہ اس سال اسلامی قوانین ازدواج کی نظر ثانی کی گئی۔ اور طلاق کے قواعد کو محدود کر دیا گیا۔ ایران کی عورتیں اب اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کرتی ہیں۔ اور وہ یہ باتیں محض بحث ومباحثہ کی خاطر نہیں کرتیں۔ بلکہ وہ اپنے حقوق کے مطالبات ماؤں اور بیویوں کی حیثیت سے کرتی ہیں۔ وہ یہ چاہتی ہیں کہ مردوں کے خیالات اور جذبات میں جبلّت جنسی کے متعلق ایک عظیم انقلاب پیدا ہو جائے، لیکن یہ خوشگوار نتائج اسلام کے حدود میں رہ کر پیدا نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ قرآن اور حدیث نے عورتوں کے لئے خاص حدیں مقرر کر دی ہیں۔ جن سے وہ تجاوز نہیں کر سکتیں۔ اگر عورتوں کی حالت کی اصلاح کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ اسلامی احکام کو توڑ کر کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تمام کوششیں اسلامی ممالک میں بارور نہیں ہوتیں۔

(5)

خود ہندوستان میں آئے دن آل انڈیا ومنس کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ اور ان میں غریب عورتوں کی یہی چیخ پکار سنائی دیتی ہے۔ تعداد ازدواج اور طلاق وغیرہ کے خلاف اور نسوانی حقوق کے لئے دھواں دھار تقریریں ہوتی ہیں اور ریزولیوشن ہوتے ہیں۔ بقول مولانا ظفر علی خان

کانگرس میں بھی ہیں کچھ مگر حق ہے یہی

گرم ہنگامہ ہند اس کی خواتین سے ہے

لیکن مولوی صاحبان قرآن وحدیث کی سپر لگائے رکھتے ہیں۔ وہ اس تحریک کو اسلامی شریعت اور سنت نبوی پر خوفناک حملے تصور کرتے ہیں۔ بصد مشکل صغر سنی (کم عمری) کی شادی کے خلاف ساردا ایکٹ پاس ہوا تھا۔ لیکن ہمارے مسلم اخبارات نے اس کو مذہبی آزادی میں بے جا مداخلت قرار دے دیا۔ علمائے کرام نے بھی ان اخبارات کی حمایت ہی کی۔ اور کہا کہ یہ سنت نبوی کے خلاف ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب ساردا ایکٹ کی قیمت صفر کے برابر بھی نہیں رہی۔ تعدا ازدواج طلاق اور صغر سنی کی شادی ہندوستانی قوم کی ترقی اور مفاد کے حق میں زہر قاتل کا اثر رکھتی ہیں۔

غرضیکہ اسلامی ممالک کی تاریخ اس حقیقت کو ظاہر کر دیتی ہے کہ اسلام میں کوئی حکم قاعدہ یا قانون ایسا نہیں۔ جس کے لئے دور حاضرہ کی عورت خدا کا شکر کر سکے۔ اگر اسلامی ممالک شاہراہ ترقی پر مہذب ممالک کے ساتھ دوش بدوش ہو کر چلنا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ وہ اسلامی شریعت دربارہ قوانین ازدواج وطلاق کو بالائے طاق رکھ دیں۔ ورنہ ترقی کا منہ دیکھنا ان کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ یہ حقیقت ایسی واضح اور روشن ہے کہ قادیان جیسے ظلمت کدہ سے بھی یہی آواز بلند ہوئی ہے۔ چنانچہ ”ریویو آف ریلیمنس بابت ستمبر 1915ء“ میں اسلامی ممالک کی حالت زار پر نوحہ کیا گیا ہے۔ اور لکھا ہے

"آج کل اسلام کی حالت کیا ہے ؟ اسلام کے ہاتھوں سے ملک نکل رہے ہیں۔ گو یہ بات درست ہے کہ ہر ملک کو قدرتی طور پر زوال آتا ہے۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ بادشاہتوں کی ایک بڑی تعداد جن کا تعلق مختلف ممالک اور اقوام سے ہے۔ اور جو دنیا کے مختلف گوشوں میں واقع ہوئے ہیں۔ ان میں ان کا مذہب اسلام ہی ایک مشترکہ بات ہے اور یہ بادشاہتیں یکے بعد دیگرے تباہ اور برباد ہو رہی ہیں۔ تو یہ ایک نہایت معنی خیز امر ہو جاتا ہے۔ اگر ایک ہی سلطنت کے مختلف حصوں میں زوال آجاتا ہے۔ تو ہم سمجھ سکتے کہ کوئی ایسی بات ہو گی جو ان میں مشترکہ ہو گی۔ جس کی وجہ سے سلطنت کے مختلف حصوں میں زوال آگیا۔ لیکن جب یہ اسلامی بادشاہتیں دنیا کے مختلف کونوں میں واقع ہوں او رایک دوسرے سے اس قدر دور دراز ہوں ۔ جس طرح الجریا، مراکو، ٹرپولی، مصر ،ہندوستان ،ایران، افغانستان ،ترکستان، فلپائین جزائر ، سوڈان، ابی سینیا وغیرہ ایک دوسرے سے دور ہیں۔ اور مختلف زمانوں میں مختلف اقوام سے متعلق ہوں اور یہ تمام اسلامی ممالک زوال پذیر ہوں۔ تو یہ ظاہر ہے کہ ان کے زوال کے سبب معمولی نہیں"

تاریخ اس قادیانی کے خیال کی تائید کرتی ہے۔ ان تمام ممالک میں جو دنیا کے مختلف گوشوں میں واقع ہیں۔ اور جن میں مختلف اقوام بستی ہیں۔ سوائے ایک بات یعنی اسلامی تعلیم کے اور کوئی شے مشترکہ نہیں۔ لہٰذا قادیانی اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اسلامی ممالک کے زوال وانحطاط کا حقیقی باعث اسلامی تعلیم ہی ہے۔

(6)

پس جہاں تک جبلّت جنسی اور اس کے اقتضاؤں کا تعلق ہے۔ اسلامی تعلیم اور قرآنی احکام درباره ازدواج وطلاق اس جبلّت کی فطرت کے خلاف ہیں اور تاریخ اسلام اس نتیجہ کی تائید کرتی ہے۔ لہٰذا اسلام دین فطرت کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ اس کے برخلاف ناظرین پر واضح ہو گیا ہو گا۔ کہ کلمتہ اللہ کی تعلیم جبلّت جنسی کے تمام اقتضاؤں کو بطرز احسن پورا کرتی ہے۔ لہٰذا مسیحیت ہی ایک ایسا مذہب ہے۔ جو دین فطرت ہو سکتا ہے۔

فصل چہارم

ماں باپ کی جبلّت یا والدینی جبلّت

والدینی جبلّت کی خصوصیات

اس جبلّت کا تعلق براہ راست نوع کے قیام اور نوع کی خدمت بہبودی اور بقا کے ساتھ ہے۔ اس کے ساتھ ماں کی مامتا اور باپ کی شفقت کے جذبات وابستہ ہیں۔ اس جبلّت کا تقاضا یہ ہے کہ بچے کی حفاظت اور پرورش ہو۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے ماں باپ بھوک پیاس تکلیف بلکہ موت بھی برداشت کرتے ہیں۔ یہ جبلّت باقی تمام جبلّتوں سے قوی اور ان پر حتیٰ کے خوف پر بھی غالب آسکتی ہے۔ اس جبلّت کی وجہ سے ماں اپنی انانیت (خودی، غرور) کو دباتی ہے۔ اور اس کی زندگی ایثار نفسی کا ایک لامتناہی (جس کی کچھ انتہا نہ ہو) سلسلہ ہو جاتی ہے۔ اور باپ کی زندگی محنت اور مشقت کی کوششوں کا مجموعہ ہو جاتی ہے۔

(۲)

ماں باپ کی جبلّت کے عمل میں جب ممانعت یا مزاحمت ہوتی ہے تو اس سے غصہ ظہور میں آتا ہے۔ اور یہ انسان کی معاشرتی زندگی کے لئے نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ مثلاً جب کوئی ہمارے بچوں کے ساتھ مزاحمت کرتا ہے تو ہم کو طیش آتا ہے۔ یہ غصہ، غضب اور جوش درحقیقت تمام اخلاقی ناخوشنودی اور اخلاقی استحقار (حقارت، نفرت کرنا) کی جڑ ہے۔ جو بچوں یا بیکس لوگوں یا نادانوں کی تکلیف یا ان پر ظلم اور زیادتی دیکھ کر ہمارے دلوں میں پیدا ہوتی ہے۔ دور حاضرہ میں انسان کی معاشرتی زندگی میں اس جبلّت کا میدان بہت وسیع ہو گیا ہے۔ اور لطیف اور نازک جذبے اسی جبلّت کی وجہ سے برانگیختہ ہوتے ہیں۔ مثلاً غلامی کے خلاف تحریک، بچوں، حیوانوں، اچھوت اقوام پر ظلم کی بندش اور ممانعت کی انجمنوں کا قیام۔ کاشتکاروں سے غلامانہ سلوک کا انسداد (روک تھام) وغیرہ وغیرہ، اسی کی وجہ سے ہیں۔ یہ نازک جذبات ہم کو مصیبت زدوں کے رفیق بنا دیتے ہیں۔ اور ہمدردی اس بات کا تقاضا کرتی ہے۔ کہ ان کی مصیبت کو کم یا ختم کر یا جائے۔ پس ماں باپ کی جبلّت یا والدینی جبلّت صرف والدین کی شفقت کی ہی ماخذ نہیں۔ بلکہ جملہ نازک جذبات کی ماخذ ہے۔ چنانچہ خیرات اور سخاوت کا ظہور شفاخانوں کا اجرا اور زرِ خطیر (کثیر، بہت) کا خرچ وغیرہ بھی اسی جبلّت کی وجہ سے ہیں۔

والدینی جبلّت اور دینِ فطرت کے لوازمات

مندرجہ بالا سطور سے واضح ہو گیا ہو گا کہ دین فطرت کا یہ کام ہے کہ بچوں کی پیدائش، پرورش، حفاظت، بہبودی اور ترقی کی نسبت احکام صادر کرے۔ والدینی جبلّت کے میدان استعمال کو وسعت دے۔ انانیت اور خودی کے دبانے اور قربانی اور ایثار نفسی کو بڑھانے کی تعلیم دے۔ ان تمام لطیف اور نازک جذبات کی تکمیل میں ممد و معاون ہو۔ جن کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے۔ نیز یہ لازم ہے کہ دین فطرت ذات الٰہی اور بنی نوع انسان کے متعلق ایسی تعلیم دے۔ جو اس جبلّت کے عین مطابق ہو۔

والدینی جبلّت اور طلاق

گزشتہ فصل میں جنسی جبلّت پر بحث کرنے کے دوران میں ہم نے یہ ذکر کیا تھا۔ کہ جبلّت جنسی والدینی جبلّت کے ساتھ مربوط اور مخلوط ہے۔ اور یہ ربط معاشرت کے لئے لازمی ہے۔ اور مبدء فطرت سے ہے۔ پس مذہب فطرت کا کام یہ ہے کہ ایسے قوانین ازدواج منضبط کرے جو نہ صرف والدینی جبلّت کی تائید کریں۔ بلکہ ان تمام امور مثلاً طلاق وغیرہ کو ممنوع اور حرام قرار دیں جو والدینی جبلّت کے اقتضاؤں کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔

مسیحیت اور طلاق

کلمتہ اللہ کی تعلیم نے طلاق کو قطعاً ممنوع اور حرام قرار دے دیا ہے چنانچہ لکھا ہے کہ "ایک دفعہ فریسیوں نے آکر آپ سے پوچھا کہ کیا یہ روا ہے۔ کہ مرد اپنی بیوی کو چھوڑ دے؟ آپ نے جواب میں فرمایا خلقت کی ابتدا سے خدا نے جوڑے کو مرد اور عورت بنایا۔ اور وہ دونوں ایک جسم ہوں گے۔ پس وہ دو نہیں بلکہ ایک جسم ہیں۔ اس لئے جس کو خدا نے جوڑا ہے۔ آدمی اسے جدا نہ کرے۔ جو کوئی اپنی بیوی کو چھوڑ دے اور دوسرے سے بیاہ کرے وہ اس پہلی کے خلاف زنا کرتا ہے۔ اور اگر عورت اپنے شوہر کو چھوڑ دے اور دوسرے سے بیاہ کرے تو زنا کرتی ہے" (مرقس ۱۰: ۲)۔ مرد اپنا یہ حق سمجھتا تھا کہ جب چاہے عورت کو جس بنا پر چاہے طلاق دے دے۔ ابن اللہ کی تعلیم نے ہر مرد پر یہ ظاہر کر دیا۔ کہ اس کا یہ مزعومہ (گمان کیا ہوا) حق انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ کیونکہ فطرت کا حقیقی منشا یہی ہے کہ مرد اور عورت ایسے دائمی تعلقات میں باہم پیوستہ ہو جائیں۔ کہ وہ دو نہیں بلکہ ایک تن اور یک جان ہوں۔ کوئی مرد یا عورت دوسرے شخص کو اپنا بدن دے کر اپنی مستقبل زندگی اس طرح بسر نہیں کر سکتی کہ گویا اس نے اپنے آپ کو جسم اور جان سمیت دوسرے کے حوالے نہیں کیا۔ یہ بات انسانی فطرت کے خلاف ہو گی جنسی تعلقات کی یکجائی اور یگانگت کا منطقیانہ نتیجہ یہی ہے۔ کہ وہ جدا نہ ہوں۔ پس فطرت اور عقل دونوں طلاق کے اصول کے خلاف ہیں۔ کیونکہ اس اصول کے مطابق جنسی تعلقات دائمی ہونے کی بجائے عارضی قرار دیئے جاتے ہیں۔ اور بیاہ پاکیزہ حالت ہونے کی بجائے ایک مضحکہ خیز امر ہو جاتا ہے۔ مسیحیت کی یہ تعلیم ہے کہ انسان کا جسم شہوت کا آلہ نہیں۔ بلکہ خدا کی روح القدس کا مسکن ہے (۱۔ کرنتھیوں ۶: ۱۹)۔ پس عورت اور مرد کے جنسی تعلقات پاکیزہ تعلقات ہیں۔ جن کا مقصد خدا کا جلال

ظاہر کرنا ہے (۱۔ کرنتھیوں ۶: ۲۰؛ عبرانیوں ۱۳: ۴؛ ۱۔ تھسلنکیوں ۵: ۲۳) مسیحیت میں نکاح ایک ایسی پاکیزہ حالت خیال کی جاتی ہے کہ وہ اس روحانی یگانگت کا نشان قرار دی گئی ہے جو مسیح اور اس کی کلیسیا کے درمیان ہے۔ چنانچہ انجیل جلیل میں مسیح کو دولھا اور کلیسیا کو دلہن کہا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب مقدس میں طلاق کے لئے جو لفظ وارد ہوا ہے۔ وہ "ارتداد" (پھر جانا، مرتد ہو جانا) ہے۔ جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ بائبل کی نگاہ میں طلاق اور ارتداد دونوں ایک ہی قسم کی ذہنیت کا نتیجہ ہیں۔

طلاق نہ صرف بیاہ کے پاکیزہ مفہوم کے خلاف ہے۔ بلکہ وہ عفو اور معافی کا دروازہ بھی بند کر دیتا ہے۔ فرض کیجئے کہ عورت سے کوئی قصور ہو گیا ہے۔ خاوند کا یہ کام ہے کہ اس کو معاف کرے۔ نہ کہ اس کو طلاق دے کر اپنی شریکِ زندگی کے مستقبل کو تاریک کر دے۔ معاف کرنا محبت کا خاصہ ہے۔ اور انسانی فطرت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ ہم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ محبت کریں۔ اور اگر ان سے کوئی قصور سرزد ہو جائے تو ملائمت سے ان کو سمجھائیں تاکہ والدینی جبلّت کا تقاضا پورا ہو۔ لیکن طلاق کا اصول عفو اور معافی اور محبت کے عین نقیض (مخالف) ہے۔ لہٰذا وہ فطرت کے خلاف ہے اور مسیحیت میں ممنوع ہے۔

اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ انسان بے غیرت ہو جائے اور اگر اس کی بیوی زناکار ہو۔ تو اس کی زناکاری کی طرف سے لاپرواہ ہو جائے۔ کلمتہ اللہ نے صاف تعلیم دی ہے کہ زنا کا گناہ ازدواج کے پاک رشتہ کو خود بخود توڑ دیتا ہے۔ کیونکہ اس سے پاک رشتہ ناپاک ہو جاتا ہے۔ لیکن ہم طلاق کے رواج پر غور کریں۔ تو ہم پر ظاہر ہو جائے گا کہ اسلامی دنیا میں مقابلتہً بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ کہ خاوند نے بیوی کو زنا کی بنا پر طلاق دی ہو۔ بالعموم طلاق کی بنا خاوند اور بیوی کی ناچاقی ہوتی ہے اور ان حالات میں عموماً خاوند کی بدمزاجی ناچاقی کا باعث ہوتی ہے۔ مندرجہ ذیل مثال میں غریب بیوی کا کیا قصور تھا؟ طلاق کی خواہش تقریباً ہمیشہ خاوند کی طرف سے ہوتی ہے کیونکہ غریب بیوی کا نہ کوئی مستقل وجود ہوتا ہے اور نہ خاوند سے جدا اس کا کوئی مستقبل ہوتا ہے۔ بلکہ عموماً یہی دیکھا گیا ہے کہ اگر خاوند زانی بھی ہو۔ تو غریب بیوی اس کے عیوب (عیب کی جمع، کمزوریوں) پر پردہ ہی ڈالتی ہے۔ اور اس کو معاف کرتی ہے اور معافی کی روح گھر کو اور بچوں کو یک جا رکھتی ہے۔ عام طور پر یہ ایک صحیح بات ہے کہ خاوند در حقیقت طلاق کا موجب ہوتا ہے۔ لیکن اگر بیوی خاوند کی بدمزاجی کی صبر سے برداشت کر سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ خاوند بیوی کی بدمزاجی اور کم فہمی اور نادانی کو معاف نہ کرے۔ خاندان کی بقا اور قیام اور بچوں کے لیے نیک نمونہ اس امر کے متقاضی ہیں کہ خاوند بیوی کے اور بیوی خاوند کے نقائص اور عیوب کی صبر سے برداشت کریں۔ اور یوں ازراہ محبت ایک دوسرے کو معاف کر کے ایک اعلیٰ خاندان کے قیام کا سبب ہوں۔

اسلام اور اخلاق

اس کے برعکس دین اسلام نے طلاق کی نہ صرف اجازت دے رکھی ہے بلکہ اس کا باب (دروازہ) کھول دیا ہے۔ خاوند جب چاہے بغیر کسی معقول وجہ کے اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔ لیکن غریب اور مظلوم بیوی کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ اپنے خاوندوں کو کسی حالت میں بھی طلاق دے سکیں۔

کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ "مرد عورتوں پر حاکم ہیں"۔(نساء38) کسی مسلمان مرد کا بیوی کو طلاق دینے پر قادر ہو کر طلاق نہ دینا اس کو دوسروں کی نظروں میں گرا دیتا ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے حضرت عمر سے جب وہ خلیفہ تھے پوچھا کہ

"کیا آپ اپنے بعد عبداللہ بن عمر کو خلیفہ نہ کریں گے۔ آپ نے فرمایا واللہ میں نے کبھی خدا اپنے بیٹے کے خلیفہ ہونے کے لئے دعا نہیں مانگی بھلا میں ایسے آدمی کو خلیفہ مقرر کر سکتا ہوں جس کو اتنی بھی جرات نہ ہو۔ کہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے"

(تاریخ الخلفا صفحہ 131)

اسلامی ممالک میں طلاق ایک عام شے ہے۔ خود ہندوستان کے تقریباً ہر شہر اور گاؤں میں یہ روز مرہ کا واقعہ ہے۔ چنانچہ ہم "رسالہ المنیر حضرت کیلیا نوالہ بابت 8/16 دسمبر 1933 کے صفحہ نمبر 10 " سے ذیل کا اقتباس بطور مشتے نمونہ از خروارے (ڈھیر میں سے مٹھی بھر، بہت کم) کرتے ہیں۔

"قریب چار ماہ کا عرصہ گذرا ہے۔ کہ تحصیل حافظ آباد ضلع گوجرانوالہ کے ایک شخص نے اپنی وفادار نیک چلن بیوی کو (جس نے کہ اپنے خاوند کی بیماری میں اسے مقروض ہوتے دیکھ کر بجائے اس کی زمین فروخت کرانے کے اپنے میکے کے تمام زیورات جو کہ اس کو جہیز میں ملے تھے۔ اور جو عام طور پر عورتوں کو پیارے ہوتے ہیں۔ گروی رکھ کر خرچ کر دیئے ہیں) اس حیرت انگیز وجہ سے طلاق دی ہے کہ خداوند کریم نے اس کے ہاں لڑکے کے لڑکی پیدا کی جس معصوم بچی کی عمر اس وقت زیادہ سے زیادہ تین سال کی ہے"۔

چنانچہ ایک دن کا ذکر ہے کہ بد قسمت بیوی مامتا کی محبت سے مجبور ہو کر اپنی لڑکی کے بالوں کو تیل لگا کر کنگھی کر رہی تھی کہ اتنے میں خاوند گھر آیا۔ اور لڑکی کو سنورتی ہوئی دیکھ کر آگ بگولا ہو کر زوجہ کو مارنا شروع کر دیا۔ اور کہا کہ لڑکی کو کیوں سنوارتی رہتی ہو۔ یہ کوئی لڑکا تو نہیں ہے۔

اس پر بیوی نے جواب دیا کہ لڑکا لڑکی تو خدائے عزوجل کے اختیار مطلق میں ہے۔ اس میں میرا قصور نہیں ہے۔ تجھے خواہ مخواہ اس وجہ سے مارنے کا حق نہیں ہے۔ البتہ آئندہ تم غیر عورتوں سے حرامکاری کرنے سے توبہ کرو تو وہ ذات پاک مہربانی فرما کر ہمیں کوئی بچہ عنایت فرمادے گا۔ اور ہماری معصوم بچی کی عمر تو اس وقت تین سال کی بھی نہیں ہے۔ اس کو سنوارنے میں کوئی حرج نہیں۔ تمام جہان اپنے بچے بچیوں کو اسی طرح سنوارے رکھتے ہیں۔ شہروں میں جا کر دیکھو کہ وہ لوگ کس طرح اپنی ننھی بچیوں کو سنوارتے اور محبت کرتے ہیں۔

خاوند نے جواب دیا کہ شہری لوگ کنجر ہوتے ہیں۔ جو لڑکیوں کو سنوارتے ہیں اور اس تکرار سے غضنباک ہو کر فوراً حجام کو بلایا۔ اور ننھی معصومہ کے بال سر سے کٹوا دیئے اور زوجہ کو مار کر گھر سے نکال دیا۔ اور ننھی بچی زبردستی روتی دھوتی اس کی گود سے چھین لی۔ اس پر وہ مجبوراً اپنے میکے چلی آئی۔ جہاں اس کے والدین پہلے ہی مر چکے ہیں۔ جن کے یہ نمک سے پلا تھا۔ جنہوں نے ہزار ہا روپوں کے زیورات کپڑے اور برتنوں کے علاوہ گیارہ عدد بھنسیں ایک گھوڑی اور ایک ڈاچی جہیز میں دی تھی۔ اب خاوند کسی نئے رشتہ کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ کہ کہیں سے کوئی اور امیر گھرانے کا شکار ہاتھ آئے چنانچہ سنا گیا ہے کہ ایک شخص نے اس شرط پر رشتہ دینا منظور کیا کہ ہے اگر وہ پہلی بیوی کو طلاق دے دے۔ اس لئے اس نے اپنی بیوی کو گھر

سے نکال دینے کے چند روز بعد موضع گکھڑ تحصیل گوجرانوالہ میں جہاں کہ وہ اپنی ایک خاص بیماری کا علاج ایک حکیم سے کرواتا تھا سے بذریعہ رجسٹری طلاق نامہ عورت کے بھائی کے نام بھیج دیا"۔

اگرچہ ایسے انسانیت سوز واقعات سے انسان کی طبیعت قدرتی طور پر متنفر ہو جاتی ہے لیکن اسلام میں شرعی دائرہ کے اندر رہے کر ایک مومن مسلمان ایسا شرمناک رویہ اختیار کر سکتا ہے۔

طلاق عورتوں کے مستقبل کو تاریک کر دیتا ہے۔ بچوں کی پرورش تعلیم اور ان کی جسمانی اور ذہنی نشوونما اور ترقی کے حق میں زہر قاتل کا اثر رکھتا ہے۔ خاندانی زندگی کی پاکیزہ حالت کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ غرضیکہ جبلّت والدینی کی راہ میں طلاق کی اسلامی تعلیم ایک ناقابل گذر رکاوٹ ہے۔ پس اسلام دینِ فطرت نہیں ہو سکتا۔

والدینی جبلّت اور بچوں کے فرائض

چونکہ والدینی جبلّت کا تعلق براہ راست نوع کے قیام اور نوع انسانی کی خدمت بہبودی اور بقا کے ساتھ ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ دین فطرت والدین کو ان کے فرائض حقوق اور ذمہ داریوں پر مطلع کرے۔ اور بچوں کو ان کے حقوق ذمہ داریوں اور فرائض کی نسبت آگاہ کرے۔ چنانچہ انجیل جلیل میں وارد ہوا ہے۔

"اے فرزندوں! خداوند خدا میں اپنے ماں باپ کے فرماں بردار رہو۔ کیونکہ یہ خداوند خدا میں پسندیدہ ہے"۔ (کلسیوں ۳: ۲۰؛ امثال ۱۹: ۲۶؛ ۲۳: ۲۲؛ ۳۰: ۱۷؛ خروج ۲۱: ۲۷ وغیرہ)۔ قرآن میں بھی والدین کی اطاعت اور خدمت کی تعلیم موجود ہے۔ مثلاً "والدین سے نیکی کرو"۔ (انعام آیت ۱۵۲، بنی اسرائیل 34۔ لقمان 13 احقاف 4 وغیرہ) پس انجیل و قرآن میں فرزندوں کے فرائض اور ذمہ داریوں کے متعلق احکام ہیں۔

والدینی جبلّت اور والدین کے فرائض

والدینی جبلّت کا تعلق خاص طور سے بچوں کے حقوق اور والدین کے فرائض اور ذمہ داریوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ انجیل جلیل میں بچوں کے حقوق پر زور دیا گیا ہے۔ کلمتہ اللہ نے فرمایا "خبردار! ان چھوٹے بچوں میں سے کسی کو ناچیز نہ جاننا۔ کیونکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ آسمان پر ان کے فرشتے میرے آسمانی باپ کا منہ ہر وقت دیکھتے ہیں۔ تمہارے باپ کی جو آسمان پر ہے یہ مرضی نہیں کہ ان چھوٹوں میں سے ایک بھی ہلاک ہو" (متی ۱۸: ۱۰؛ لوقا ۱۸: ۱۵؛ مرقس ۱۰: ۱۶؛ ۹: ۳۶؛ لوقا ۱۷: ۳ وغیرہ)۔ مزید برآں والدین کو ان کی ذمہ داریوں اور فرائض سے آگاہ کیا گیا ہے "اے بچے والو خداوند کی طرف سے تربیت اور نصیحت دے دے کر ان کی پرورش کرو اور اپنے فرزندوں کو غصہ نہ دلاؤ" (افسیوں ۶: ۳)۔ "اے بچے والو اپنے فرزندوں کو دق نہ کرو کہ وہ بیدل نہ ہو جائیں" (کلسیوں ۳: ۳۰)۔ "وہ اپنے بیٹوں کو حکم دے کہ وہ خداوند کی راہ میں قائم رہ کر عدل و انصاف کریں" (پیدائش

۱۸: ۱۹) ۔"خدا کے یہ حکم تو اپنی اولاد کے ذہن نشین کرنا" (استثنا۶: ۷؛۴: ۹؛۱۱: ۱۹؛زبور۷۸ : ۴وغیرہ)۔"جب تک امید ہے اپنے بیٹے کی تادیب کئے جااور اس کی بربادی پر دل نہ لگا"(امثال۱۹: ۱۸) لڑکے کی اس راہ میں تربیت کر جس پر اسے جانا ہے۔وہ بڑا ہو کر بھی اس سے نہ مڑے گا(امثال ۲۲: ۶؛۲۹: ۱۷وغیرہ)"جوان عورتیں اپنے بچوں کو پیار کریں" (ططس ۲: ۴وغیرہ وغیرہ)۔

قرآن میں بچوں کے حقوق اور والدین کے فرائض اور ان کی ذمہ داریوں کی نسبت کہیں بھی ذکر نہیں۔اس کے برعکس صاف اور واضح الفاظ میں ہے کہ "تم جان لو کہ تمہاری اولاد فتنہ ہے"(انفال آیت ۲۸۔ آل عمران ۱۲ کہف 43وغیرہ)۔جب اولاد "فتنہ" ٹھہری تو اس کے حقوق کیا اور ماں باپ کی ذمہ داری کیا؟ قرآن میں بچوں کے حقوق اور والدین کی ذمہ داریوں کا ذکر نہیں پایا جاتا لیکن والدین جبلّت کا تعلق ان امور کے ساتھ خاص طور پر ہے ۔انجیل جلیل میں بچوں کے حقوق اور والدین کی ذمہ داریوں کا تاکیداً حکم ہے۔پس جہاں تک والدینی جبلّت کے اقتضاؤں کا تعلق ہے اسلام دین فطرت کہلانے کا مستحق ہو نہیں سکتا۔لیکن مسیحیت اس جبلّت کے تمام اقتضاؤں کو پورا کرتی ہے۔لہٰذا وہ دین فطرت ہے۔

والدینی جبلت اور ذات الٰہی کا تصور

خالق نے والدینی جبلّت ہماری سرشت میں ودیعت فرمائی ہے۔پس اس جبلّت کے تقاضاؤں کو انسان بخوبی جانتا ہے۔پس اگر کوئی مذہب ایسا ہو جو اس جبلّت کے ذریعہ خدا کی ذات کا علم ہم پر منکشف (کشف کرنا، ظاہر کرنا) کرے۔تو ہم اس علم کو جان سکیں گے۔کیونکہ علم نفسیات کا یہ کلیہ قاعدہ ہے کہ ہم ایک نامعلوم اور غیر مانوس شے کو کسی معلوم شے کہ ذریعہ جان سکتے ہیں۔پس ہم خدا کی ذات کا علم اپنی سرشت کے قواء اور طبعی رجحانات کے ذریعہ اور بالخصوص والدینی جبلّت کے ذریعہ حاصل کر سکتے ہیں۔چونکہ یہ جبلّت دیگر جبلّتوں سے قویٰ اور طاقت ور ہوتی ہے۔لہٰذا اگر کوئی مذہب خدا کی ذات وصفات کا علم جبلّت والدینی کے ذریعہ ہم پر ظاہر کرے تو ہم کو اس جبلّت کے ذریعہ خدا کی ذات وصفات کا علم زیادہ حاصل ہو سکتا ہے۔

والدینی جبلّت اور مسیحی اور اسلامی تصور خدا

مسیحیت کے دینِ فطرت ہونے کا یہ بین ثبوت ہے کہ ہم خدا کی ذات کا علم اس طور پر حاصل کر سکتے ہیں۔مسیحیت کی یہ تعلیم ہے کہ خدا بنی نوع انسان کا باپ ہے۔پس ہر انسان اپنی والدینی جبلّت کے ذریعہ خدا کی ذات کا تصور قائم کر سکتا ہے۔اور اپنے تجربہ کی بنا پر خدا کی محبت اور اس کے ایثار کا اندازہ کر سکتا ہے۔

کلمتہ اللہ نے ہم کو یہ تعلیم دی ہے کہ خدا ہمارا باپ ہے۔جس کی ذات محبت ہے۔خدا اور انسان کا باہمی تعلق باپ اور بیٹے کا تعلق ہے۔پس والدینی جبلّت گویا عالم روحانیت کے حقائق کی ایک جھلک ہے۔اس عالم میں بقائے نوع کا انحصار جبلّت والدینی پر ہے۔یہ ایک مثال ہے جس کے ذریعہ ہم سمجھ سکتے ہیں۔کہ روحانی عالم میں بنی نوع انسان کی روحانی بہبودی کا اور اس کی بقا کا انحصار اس بات پر ہے کہ خدا ہمارا باپ ہے۔جو ہم سے ازلی اور ابدی محبت رکھتا ہے (متی ۷: ۱۱؛لوقا ۱۱: ۱۳؛افسیوں ۴: ۶؛۱۔کرنتھیوں ۸: ۶ وغیرہ)"چونکہ تم بیٹے ہو۔اس لئے خدا نے اپنے بیٹے کا روح ہمارے دلوں میں بھیجا

ہے جو ابا یعنی اے باپ کہہ کر پکارتا ہے" (گلتیوں ۴:۴) ۔"دیکھو باپ نے ہم سے کیسی محبت کی کہ ہم خدا کے فرزند کہلائے اور ہم فرزند ہیں بھی" (۱۔یوحنا۳: ۱) ۔ہم بخوف طوالت آیات کے اقتباس سے پرہیز کرتے ہیں۔اور صرف اس قول پر اکتفا کرتے ہیں کہ انجیل جلیل کی تمام کتب میں لفظ "باپ" خدا کے لئے وارد ہوا ہے۔اور ان کتب کا کوئی باب نہیں ۔جس میں یہ خطاب ایک یا ایک سے زیادہ دفعہ صراحتاً یا کنایتہً وارد نہ ہوا ہو۔کل ادیان عالم میں صرف مسیحیت ہی ایک مذہب ہے۔جو خدا اور انسان کے باہمی رشتہ کے متعلق تعلیم دیتا ہے کہ خدا ہمارا باپ ہے جس کی ذات محبت ہے اور ہم اس کے بیٹے ہیں۔

اسلام میں اس قسم کا تصور نہیں پایا جاتا۔قرآن کے مطابق خدا کی ذات محبت نہیں۔اس کے برعکس "اللہ بے نیاز ہے"(سورہ اخلاص ۲۔بقر ۲۷۔آل عمران ۹۲۔نساء130۔یونس 69 حج 65 وغیرہ) پس اللہ اور انسان میں رفاقت ناممکن ہے۔اسلام میں خدا کے ننانوے نام ہیں۔لیکن ان اسمائے حسنہ میں "اب" یعنی باپ کا نام موجود نہیں۔اور نہ اس خطاب کا پاکیزہ اور لطیف مفہوم کسی اور نام سے موجود ہے۔خدا کے مسیحی تصور اور اللہ کے اسلامی تصور میں بعد المشرقین ہے۔اگر اسلام کا اللہ مہربان غفار اور رحمٰن الرحیم ہے۔تو وہ اپنی پدرانہ شفقت اور ازلی محبت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اپنی خسروانہ (بادشاہی کے طریقے سے) عنایات کی وجہ سے ہے۔وہ ایک قادر مطلق سلطان اور غیر ذمہ دارانہ ہستی ہے جس کی مطلق العنان مرضی پر موقوف ہے کہ جس کو چاہے معاف کرے اور جس کو چاہے عذاب دے اور جو چاہے حکم دے (بقر 284۔آل عمران 25و35۔مائدہ آیت او44 وغیرہ) غرض یہ کہ اسلامی تعلیم کا الٰہی ذات کے تصور کے بارے میں والدینی جبلّت کے ساتھ دور کا واسطہ بھی نہیں۔جہاں تک اسلام کا تعلق ہے انسانی سرشت الٰہی ذات کے سمجھنے میں کسی قسم کی مدد نہیں دے سکتی۔قرآن کے مطابق اللہ کی ذات انسانی فطرت سے اس قدر بلند بالا اور ارفع اور منزہ ہے کہ دونوں میں ایسی خلیج حائل ہے جس کی وسعت بے اندازہ اور لامحدود ہے (سورہ نحل ۶۲ وغیرہ) اس وسیع خلیج کے خلاف اہل شیعہ نے اور بھائی مذہب والوں نے اور صوفیا نے مختلف زمانوں اور ملکوں میں اپنی صدائے احتجاج بلند کی ہے۔کیونکہ یہ اصول ہی انسان کی فطرت کے خلاف ہے کہ خدا اور انسان میں ایک ایسی خلیج حائل کر دی جائے جس کی وجہ سے ان دونوں میں تعلقات کا ہونا محال ہو۔انسانی فطرت اس قسم کی تعلیم کے خلاف علم بغاوت بلند کرتی ہے۔اگر کوئی مذہب اس بغاوت کو مختلف طریقوں سے فرو کرنے کی کوشش کرتا ہے۔تو وہ انسانی فطرت پر جبر کرتا ہے۔انسانی فطرت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ خدا اور انسان کی ذات میں کسی قسم کا بُعد (فاصلہ، دوری) نہ ہو۔بلکہ دونوں کے باہمی تعلقات ایسے ہوں جن کا خاصہ محبت اور شفقت ہو۔پس اس نکتہ نظر سے بھی اسلام دینِ فطرت نہیں ہو سکتا۔اس کے برعکس مسیحیت کی تعلیم عین فطرت کے تقاضاؤں کے مطابق ہے۔

سطور بالا میں ذکر ہو چکا ہے کہ جبلّت والدینی کی وجہ سے انسان ہر طرح کی تکلیف، دکھ، اذیت بلکہ موت تک برداشت کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔کیونکہ اس جبلّت کا اقتضا اور محبت کا جوہر قربانی اور ایثار ہے۔کلمتہ اللہ نے ہم کو یہ تعلیم دی ہے کہ چونکہ خدا بنی نوع انسان کے ساتھ ابدی اور اٹل محبت رکھتا ہے۔لہٰذا اپنی پدارانہ محبت اور پیار کی وجہ سے خدا انسان کی خاطر ہر قسم کا دکھ اور رنج برداشت کرتا ہے۔والدین کی محبت کا ظہور اسی میں ہے کہ وہ اپنے بچوں کی خاطر دکھ اٹھائیں۔ماں کی مامتا کا ظہور اسی میں ہے کہ وہ اپنے بچہ کی خاطر رات کو جاگتی اور دن کو بیقرار رہتی ہے۔حق تو یہ ہے کہ محبت اور ایثار ایک ہی حقیقت کے دو مختلف نام ہیں۔اسی طرح خدا کی محبت کا ظہور اس رنج اور تڑپ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔جو ہمارا آسمانی باپ ہر گنہگار انسان کے

لئے محسوس کرتا ہے الٰہی محبت کامل ہے۔ لہٰذا وہ محبوب گنہگار کی خاطر ہر طرح کا دکھ اٹھانے کو تیار ہے "خدا نے دنیا سے ایسی محبت رکھی کہ اس نے اپنا اکلوتا بیٹا بخش دیا تاکہ جو کوئی اس پر ایمان لائے ہلاک نہ ہو بلکہ ہمیشہ کی زندگی پائے" (یوحنا۳: ۱۶)۔ صلیبِ مسیح خدا کی محبت اور پیار کا بہترین مکاشفہ ہے۔ یہ صداقت ابن اللہ کی زندگی اور موت کے ذریعہ دنیا پر مثلِ آفتاب نصف النہار روشن ہوگئی ہے اور یہ حقیقت والدینی جبلّت کا تقاضا ہے "خدا نے اپنی محبت کی خوبی ہم پر یوں ظاہر کی جب ہم گنہگار ہی تھے تو مسیح ہماری خاطر موا" (رومیوں ۵: ۸؛۱۔یوحنا۴: ۱۰ وغیرہ)۔

اسلامی تعلیم کے مطابق "اللہ بے پرواہ ہے" (اخلاص ۲) جو گنہگاروں سے محبت نہیں رکھتا (آل عمران 50 وغیرہ) یہ امر توضیح (وضاحت) کا محتاج نہیں کہ بے پرواہی بے نیازی اور دیگر ایسی صفات جو قرآن اور اسلام کے اللہ میں بکثرت موجود ہیں محبت کے قطعاً منافی ہیں۔ ان میں اور والدینی جبلّت میں بعد المشرقین ہے۔ ماں کی مامتا اگر بچہ کی طرف سے بے پرواہ اور بے نیاز ہو جائے تو بچہ کا زندہ رہنا امر محال ہے۔ اسی طرح اگر خدا بے نیاز ہو تو انسان کی روح کا زندہ رہنا محالات میں سے ہوگا۔ جب خدا ہی گنہگار کا دشمن ہے اور وہی انتقام لینے والا ٹھہرا تو گنہگار کا ٹھکانہ کہاں رہا؟ (فاطر 44۔ ہود 104 وغیرہ) اسی واسطے قرآن اس کا ٹھکانہ جہنم تجویز کرتا ہے۔ لیکن کتاب مقدس کی تعلیم کے مطابق "خدا گنہگار کی موت نہیں چاہتا" (حزقی ایل ۳۳: ۱۱) ۔ بلکہ اس کی پدرانہ شفقت اس امر کی متقاضی ہوئی کہ "جب ہم کمزور ہی تھے تو عین وقت پر مسیح بے دینوں کی خاطر موا" (رومیوں ۵: ۶ وغیرہ)۔ خدا کا پیار اور اس کی پدرانہ محبت صلیب مسیح میں جلوہ گر ہوئی۔ "خدا محبت ہے۔ جو محبت خدا کو ہم سے ہے۔ وہ اس سے ظاہر ہوئی کہ خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے کو دنیا میں بھیجا ہے تاکہ ہم اس کے سبب سے زندہ رہیں۔ محبت اس میں نہیں کہ ہم نے خدا سے محبت کی بلکہ اس میں ہے کہ اس نے ہم سے محبت کی اور ہمارے گناہوں کے کفارے کے لئے اپنے بیٹے کو بھیجا؟ (یوحنا۴: ۸۔۱۰) اس کے برعکس قرآن کہتا ہے کہ "اللہ کو جہان کے لوگوں کی پرواہ نہیں (عنکبوت 5)۔

قرآنی تعلیم کے مطابق خدا کی ذات میں محبت اور ایثار نہیں۔ محبت اور ایثار والدینی جبلّت کا خاصہ ہیں۔ لہٰذا اسلام خدا کی ذات کے بارے میں ایسی تعلیم دیتا ہے۔ جو انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ پس اس نکتہ نگاہ سے بھی اسلام دینِ فطرت نہیں ہو سکتا۔ صرف مسیحیت کی تعلیم ہی فطرت کے مطابق ہے۔

جبلّت والدینی اور مسیحی اور اسلامی اخوت انسانی

کلمتہ اللہ نے ہم کو یہ تعلیم دی ہے کہ چونکہ خدا ہمارا باپ ہے لہٰذا کل بنی نوع انسان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ اخوت انسانی ابوت خداوندی کا لازمی اور منطقیانہ نتیجہ ہے۔ آپ نے فرمایا "میرا حکم یہ ہے کہ جیسا میں نے تم سے محبت رکھی تم بھی ایک دوسرے سے محبت رکھو" (یوحنا ۱۵: ۱۲؛ ۱۔یوحنا۴: ۷؛۳: ۱۱؛۲: ۱۰ وغیرہ) جیسا تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں۔ تم بھی ان کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرو۔ اگر تم اپنے محبت کرنے والوں ہی سے محبت رکھو۔ تو تمہارا کیا احسان ہے؟ اور اگر تم صرف ان ہی کا بھلا کرو جو تمہارا بھلا کریں تو تمہارا کیا احسان ہے تم اپنے دشمنوں سے محبت رکھو۔ اور ان کا بھلا کرو تو تم خدا تعالیٰ کے محبوب ٹھہروگے" (لوقا ۶: ۳۱)۔ کلمتہ اللہ کے اصول ابوت الٰہی اور اخوت و مساوات انسانی مسیحیت کو تمام ادیان عالم سے ممتاز کر دیتے ہیں اور حقیقی معنوں میں اس کو عالمگیر مذہب اور دینِ فطرت بنا دیتے ہیں ۔ کلمتہ اللہ نے دیدہ دانستہ اس اصول کو دیگر

مذاہب اور اپنے دین قیم (قائم کرنے والا، نگران) میں حدِ فاصل (وہ حد جو دو چیزوں کو ایک دوسرے سے الگ کردے) کے طور پر مقرر کیا۔ آپ کو اس امر کا احساس تھا کہ اصول اخوت انسانی عالم اخلاقیات میں ایک نیا نصب العین ہے۔ جس سے پہلے مذاہب نا آشنا تھے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا "تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا کہ اپنے پڑوسی سے محبت رکھ اور اپنے دشمن سے عداوت۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو تا کہ تم اپنے پروردگار کے جو آسمان پر ہے محبوب ٹھہرو (متی ۵ باب؛ یوحنا ۱۳: ۳۴؛ ۱۵: ۱۲)۔ پس منجی عالمین نے اس والدینی جبلّت کے ذریعہ دنیائے اخلاق کے سامنے انسانی اخوت کا ایک نیا تصور پیش کیا۔ آپ کے زمانہ میں مختلف اقوام میں بے شمار امتیازات تھے۔ اہل یہود بت پرست غیر اقوام کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور تمام غیر یہود کو لفظ "پڑوسی" کے دائرہ سے خارج کر کے ان سے شریعت کے حکم کے مطابق عداوت رکھتے تھے۔ کلمتہ اللہ نے ایک تمثیل کے ذریعہ یہ تعلیم دی کہ لفظ "پڑوسی" میں کل نوع انسان شامل ہے (لوقا ۱۰: ۲۵) لیکن یہود اس حقیقت کو بالائے طاق رکھ کر نہ صرف بت پرست غیر اقوام سے بلکہ سامریوں سے بھی نفرت کرتے تھے (یوحنا ۴: ۹)۔ سامری بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دے کر اہل یہود سے بغض اور عداوت رکھتے تھے (لوقا ۴: ۵۴)۔ رومی بھی یہود کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے خود اہل یہود میں صدوقی اور فریسی ایک دوسرے کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ فریسی عامتہ الناس (عام لوگوں) کو ملعون ہیچ اور اچھوت سمجھتے تھے لیکن کلمتہ اللہ نے اخوت انسانی کا نصب العین سب کے سامنے رکھا اور فرمایا کہ بنی نوع انسان ہر فرد بشر ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نصب العین کے ذریعہ آپ نے ہر طرح کا امتیاز اور فرقہ بندی کا قلع قمع کر دیا۔ تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ ہر زمانہ اور ملک اور قوم میں مسیحیت نے درجہ بندی، مناقشت (جھگڑا، قصہ)، منافرت (نفرت، پرہیز) اور تمام مصنوعی اور عارضی امتیازات کو بیخ و بن (جڑ) سے اکھاڑ پھینکا (گلتیوں ۳: ۲۸)۔ خود ہندوستان میں مسیحیت نے ہمارے ہم وطنوں کو ایک دوسرے سے محبت کرنے اور برادرانہ الفت رکھنے کی تعلیم دی۔ اور بالخصوص مسیحی کلیسیا نے سید، برہمن، انگریز، ہندوستانی ہندو، سکھ، چوہڑہ اور مسلمان وغیرہ تمام امتیازات کو سرے سے مٹا دیا ہے۔ کیونکہ انجیل جلیل کا ایک ایک ورق اخوت انسانی کے سنہرے اصول سے مزین (آراستہ) ہے (رومیوں ۱۳: ۸؛ متی ۱۸: ۱۰؛ رومیوں ۱۲: ۵؛ یوحنا ۱۳: ۳۴؛ ۱۔ یوحنا ۴: ۲۰؛ گلتیوں ۵: ۱۳؛ ۱۔ کرنتھیوں ۱۳ باب وغیرہ)۔ کلمتہ اللہ نے فرمایا کہ تمام توریت اور صحائف انبیاء کا مدار الٰہی محبت اور انسانی اخوت و مساوات پر ہے (مرقس ۱۲: ۲۹؛ متی ۲۲: ۴۰) آپ نے تمثیلوں کے ذریعہ یہ سبق سکھایا کہ ہر شخص بلا امتیاز رنگ، نسل، ذات، درجہ اور قوم وغیرہ دوسرے سے اپنے برابر محبت رکھے (لوقا ۱۰ باب، متی ۱۸ باب، ۲۵ باب وغیرہ) مولانا حالی کا یہ شعر انجیل اور صرف انجیل پر ہی صادق آتا ہے۔

یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدا کا

کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

کلمتہ اللہ کی تعلیم نے والدینی جبلّت کے ذریعہ خاندانی اصطلاحات کے استعمال سے ابوت الٰہی اور اخوت انسانی کے اصول ہر ملک اور قوم کو سکھا دیئے۔ آپ کی تعلیم کی اساس ہی یہی ہیں کہ خدا ہمارا باپ ہے اور کل بنی نوع انسان اس کے بیٹے ہیں۔ آپ کی تمثیلیں خاندانی تعلقات سے بھری پڑی ہیں جن کے ذریعہ آپ نے ازلی اصول کی تلقین کی (لوقا ۱۵ باب متی ۱۳ باب متی ۶: ۹ وغیرہ) نوع انسانی کے متعلق آپ کا نصب العین ایک خاندان کا نصب

العین ہے جس میں کل اقوام عالم کے تمام افراد ایک ہی خاندان سے متعلق کئے گئے ہیں۔ پس کلمتہ اللہ نے والدینی جبلّت کے ذریعہ خدا کی محبت اور ابوت اور انسانی اخوت و مساوات کے اصول کی حقیقت ہم پر منکشف کر دی ہے۔

اسلام میں اخوت انسانی کا اصول ڈھونڈھے سے بھی نہیں ملتا۔ قرآن میں ایک جگہ وارد ہے کہ "مسلمان آپس میں بھائی ہیں" (حجرات آیت 10) اس آیت کے ذریعہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ اہل اسلام کے ساتھ برادرانہ سلوک کریں۔ لیکن ان پر یہ فرض نہیں کہ وہ کسی غیر مسلم سے محبت رکھیں۔ کیونکہ غیر مسلموں سے محبت کرنا قرآن میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ ان کے برعکس ان کے ساتھ دشمنی رکھنے اور لڑنے کے احکام قرآن میں بکثرت موجود ہیں (مائدہ آیت 56 و 62 ممتحنہ آیت 9 وغیرہ) اہل اسلام کو حکم ہے کہ یہودی شرع کی طرح "اپنے محبت رکھنے والوں ہی سے محبت رکھو اور اپنے دشمن سے عداوت رکھو"۔ یہاں تک کہ اسلام نے دنیا کو دو حصوں میں منقسم کر دیا ہے۔ ایک دارالاسلام اور دوسرا دارالحرب اور مسلمانوں پر فرض کر دیا گیا ہے کہ غیر مسلموں کو قتل کریں۔ خواہ یہ بات مسلمانوں کو بری لگے (بقر آیت 214۔ انفال 62 و 66۔ توبہ آیت 1 تا 29۔ تحریم 9 محمد آیت 4 و 5۔ انفال آیت 40 وغیرہ وغیرہ) لیکن مسلمان کا قتل عمداً و سہواً (ارادای اور غیر ارادی طور پر) ممنوع ہے (نساء آیت 94 و 95)۔

چنانچہ مشکواۃ کتاب الجہاد باب الجزیہ میں ابن عباس سے روایت ہے کہ

"رسول خدا نے فرمایا کہ ایک ملک میں دو قبلے روا نہیں اور مسلمان پر جزیہ روا نہیں ہے"۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی اسلامی ملک میں اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین بطریق مساوات نہیں رہ سکتا اور اگر کوئی ذی مسلمان ہو جائے تو اس سے جزیہ لینا روا نہیں۔

پس ثابت ہو گیا کہ مسیحیت ہی ایک واحد مذہب ہے جو خدا اور انسان کے باہمی رشتہ اور بنی نوع انسان کے باہمی تعلقات کی نسبت ایسی تعلیم دیتا ہے جو جبلّت والدینی کے تقاضاؤں کے مطابق ہے۔ پس مسیحیت ہی دینِ فطرت کہلانے کی مستحق ہو سکتی ہے۔ اسلام بنی نوع انسان کے باہمی تعلقات کے متعلق ایسی تعلیم کی تلقین کرتا ہے۔ جو اس جبلّت کے تقاضاؤں کو نہ صرف پورا نہیں کرتی بلکہ ان کے منافی ہے۔ لہٰذا اسلام دینِ فطرت کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

جبلّت والدینی اور مسیحی اور اسلامی فضائل

والدینی جبلّت کے ساتھ وہ تمام لطیف جذبات وابستہ ہیں۔ جن پر مسیحی تعلیم زور دیتی ہے۔ چنانچہ کلمتہ اللہ کی تعلیم میں دل کی غریبی، حلم، رحم، صبر، صلح، پاکیزگی، محبت، ایثار نفسی اور خود فراموشی وغیرہ کو افضل جگہ دی گئی ہے۔ اور یہ نسوانی فضائل شمار کی جاتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس اسلام نے ہمیشہ مردانگی، شجاعت، جنگ، جہاد، حکومت، سیاست، غنیمت اور قصاص وغیرہ پر زور دیا ہے جو مردانہ فضائل ہیں۔ والدینی جبلّت کا تعلق نسوانی

فضائل، نازک جذبات اور لطیف خیالات کے ساتھ ہے۔ لیکن مردانہ فضائل نازک اور لطیف جذبات کو ٹھکراتی ہیں۔ پس اس پہلو سے بھی اسلام کی نسبت مسیحیت کا تعلق والدینی جبلّت اور انسانی فطرت کے ساتھ زیادہ قریب ہے۔

جبلّت والدینی اور غصہ کا جذبہ

اس فصل کے شروع میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ جبلّت والدینی کا یہ خاصہ ہے کہ جب اس کے عمل میں مزاحمت یا رکاوٹ ہوتی ہے تو غصہ اور طیش ظہور میں آتا ہے۔ اسی طرح جب ہم کسی بیکس حیوان یا انسان پر زیادتی اور ظلم ہوتا دیکھتے ہیں۔ تو ہم جوش میں آجاتے ہیں اور مظلوم کی حمایت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس بات کا مفصل ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔ اس کی مثالیں ہم کو انجیل جلیل میں ملتی ہیں۔ یہاں بخوف طوالت صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ انجیل جلیل میں وارد ہے کہ منجی عالمین ایک دفعہ عبادت خانہ میں گئے۔ "اور وہاں ایک آدمی تھا جس کا ہاتھ سوکھا ہوا تھا۔ اور وہ اس کی تاک میں رہے کہ اگر وہ اسے سبت کے دن اچھا کرے تو اس پر الزام لگائیں"۔ اس ایک واقعہ سے ہم آنخداوند کے دشمنوں کی سخت دلی اور بے رحمی کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو وہ اس غریب بیکس انسان پر روا رکھتے تھے جس کا ہاتھ سوکھا ہوا تھا۔ آپ کے رحم و محبت نے جوش کھایا اور آپ نے "ان کی سخت دلی کے سبب غمگین ہو کر چاروں طرف غصے سے نظر کر کے اس آدمی سے فرمایا کہ اپنا ہاتھ بڑھا۔ اس نے بڑھا دیا اور اس کا ہاتھ درست ہو گیا" (مرقس ۳: ۱)۔

جبلّت والدینی اور ایثار نفسی

اس فصل کے شروع میں ہم نے یہ ذکر کیا تھا۔ کہ دور حاضرہ میں ماں باپ کی جبلّت کا میدان عمل بہت وسیع ہو گیا ہے۔ فی زمانہ ہم کو ایسی تحریکات نظر آتی ہے۔ جن کا تعلق حیوانوں، بچوں، کمزوروں، لاچاروں، بیکسوں مظلوموں، مصیبت زدوں، مفلسوں وغیرہ کی امداد کے ساتھ ہے۔ ان تمام تحریکوں اور کوششوں کا ماخذ ماں باپ کی جبلّت ہے۔ اسی جبلّت کی وجہ سے ہمارے اندر ہمدردی اور نازک جذبے پیدا ہوتے ہیں۔ جن کی وجہ سے ہم بے اختیار ہو جاتے ہیں۔ اور ہم دنیا کے بیکسوں اور مظلوموں کی حمایت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی جہالت کو دور کرنے کے لئے مدرسے جاری کرتے ہیں ان کی امراض کو رفع کرنے کی خاطر شفاخانے کھول دیتے ہیں۔ ان کی بھوک مٹانے کے لئے لنگر خانے کھل جاتے ہیں۔

مسیحی اور اسلامی ایثار

دین فطرت کا کام یہ ہے کہ والدینی جبلّت کے میدان عمل کو وسیع کر دے اور اس باب میں مسیحیت کو کل ادیان عالم پر فوقیت حاصل ہے۔ بچوں، بیکسوں، مظلوموں، محتاجوں، بے یارو مددگار لوگوں کی خاطر اپنی خودی اور انانیت کو دبانا اور ان کی خاطر ہر طرح کی ایثار نفسی کو کام میں لانا مسیحیت کا جزو اعظم ہے (مرقس ۸: ۳۵) "ہم کو جو توانا ہیں چاہیے کہ ناتوانوں کی کمزوریوں کا لحاظ رکھیں اور نہ کہ اپنی خوشی کریں۔ ہم میں سے ہر ایک شخص

دوسرے کو اس کی بہتری کے واسطے خوش کرے تا کہ اس کی ترقی ہو۔ کیونکہ مسیح نے بھی اپنی خوشی نہیں کی" (رومیوں ۱۵: ۱)۔" ہر ایک اپنے ہی احوال پر نہیں۔ بلکہ دوسروں کے احوال پر نظر رکھے۔ ویسا ہی مزاج رکھو جیسا سیدنا مسیح کا تھا۔ جس نے اپنے آپ کو خالی کر دیا" (فلپیوں ۲: ۴۔۵) "مبارک ہے وہ جو غریب کا خیال رکھتا ہے" (زبور ۴۱: ۱)۔"مظلوموں کی مدد کرو۔ یتیموں کی فریاد رسی کرو بیواؤں کے حامی ہو" (یسعیاہ ۱: ۱۷) "تو اپنی روٹی بھوکوں کو کھلا اور مساکین کو جو آوارہ ہیں اپنے گھر میں لا۔ جب کسی کو ننگا دیکھے تو اسے پہنا۔ اور اپنے ہم جنسوں سے روپوشی مت کر۔ تب تیری روشنی صبح کی مانند پھوٹ نکلے گی "(یسعیاہ ۵۸: ۷)۔ "ہر شخص اپنے بھائی پر کرم اور رحم کرے اور بیوہ اور یتیم اور مسافر اور مسکین پر ظلم نہ کر" (زکریاہ ۷: ۱۰)۔ "خیرات بانٹنے والا سخاوت سے بانٹے رحم کرنے والا خوشی سے رحم کرے مسافر پروری میں لگے رہو۔ اگر تیرا دشمن بھوکا ہو تو اسے کھانا کھلا۔ اگر پیاسا ہو تو اسے پانی پلا" (رومیوں ۱۲ باب)"جس کے پاس دنیا کا مال ہو اور وہ اپنے بھائی کو دیکھ کر رحم کرنے میں دریغ کرے تو اس میں خدا کی محبت کیونکر قائم رہ سکتی ہے" (۱۔یوحنا ۳: ۱۷)۔ "ہمارے خدا اور باپ کے نزدیک خالص اور بے عیب دینداری یہ ہے کہ یتیموں اور بیواؤں کی مصیبت کے وقت ان کی خبر لیں"(یعقوب ۱: ۲۷)۔

ایک دفعہ ایک دولتمند شخص کلمتہ اللہ کے پاس آیا اور پوچھنے لگا۔ کہ "اے استاد میں کونسی نیکی کروں تا کہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ اگر تو کامل ہونا چاہتا ہے تو جا اپنا مال واسباب بیچ کر غریبوں کو دے تجھ کو آسمان پر خزانہ ملے گا"(متی ۱۹: ۲۱)۔ کلمتہ اللہ نے فرمایا کہ عدالت کے روز ہر فرد بشر کا حساب رحم کے اصول پر لیا جائے گا۔ اور آپ نیک لوگوں کو مخاطب کر کے فرمائیں گے ۔" اے میرے باپ کے مبارک لوگو جو بادشاہت بنائے عالم کے وقت سے تمہارے لئے تیار کی گئی ہے۔ اسے میراث میں لو کیونکہ میں بھوکا تھا تم نے مجھے کھانا کھلایا۔ میں پیاسا تھا تو تم نے مجھ کو پانی پلایا۔ میں پردیسی تھا تو تم نے مجھے اپنے گھر میں اتارا۔ میں ننگا تھا تو تم نے مجھے کپڑا پہنایا۔ بیمار تھا تم نے میری خبر لی۔ قید میں تھا تم میرے پاس آئے۔ تب راستباز اس کو جواب میں کہیں گے کہ اے مولا ہم نے کب آپ کو بھوکا دیکھ کر کھانا کھلایا یا پیاسا دیکھ کر پانی پلایا؟ ہم نے کب آپ کو پردیسی دیکھ کر گھر میں اتارا یا ننگا دیکھ کر کپڑا پہنایا؟ ہم کب آپ بیمار یا قید میں دیکھ کر آپ کے پاس آئے ؟ بادشاہ جواب میں ان سے کہے گا میں تم سے سچ کہتا ہوں چونکہ تم نے میرے ان سب سے چھوٹے بھائیوں میں سے کسی ایک کے ساتھ یہ کیا اس لئے میرے ہی ساتھ یہ کیا" (متی ۲۵: ۳۴)۔ اس قسم کے محرکات باقی تمام ادیان عالم میں مفقود (لاپتہ) ہیں۔ ان آیات میں اور انجیل کے دیگر مقامات میں منجی عالمین نے اپنے آپ کو فقر و مسکنت کا مجسمہ قرار دے دیا اور فرمایا کہ جو لوگ محتاجوں، بیماروں، یتیموں، قیدیوں، مظلوموں اور بیکسوں کی خدمت کرتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتے ہیں۔ وہ "میرے ہی ساتھ "کرتے ہیں۔ یہ محرکات اور مرغبات کسی دوسرے مذہب میں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لطیف اور نازک جذبات جو والدینی جبلّت سے متعلق ہیں۔ مسیحیت کا جزو لاینفک (وہ حصہ جو علیحدہ نہ ہو سکے) ہو گئے ہیں۔

خود منجی کونین کی زندگی پر ایک سطحی نگاہ ڈالو تو معلوم ہو جائے گا کہ جہاں میں آپ نے کسی مصیبت زدہ بیمار، مفلوج، اندھے، لنجے، کوڑھی کو دیکھا۔ آپ کی محبت جوش زن ہوئی اور آپ نے اس کو شفا بخشی۔ اس جبلّت کے میدان عمل کو آپ نے یہاں تک وسعت دی کہ آپ نے دعوت عام دے کر علی الاعلان فرمایا" اے سب محنت اٹھانے والو اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو میرے پاس آؤ میں تم کو آرام دوں گا"(متی ۲۸: ۱۱)۔

(۲)

قرآن میں آیا ہے "تم جو خیرات دیتے ہو یا نذر مانتے ہو۔ اللہ اس کو جانتا ہے اور اگر تم خیرات کو ظاہر کر کے دو تو اچھی بات ہے اور اگر اسے چھپاؤ اور فقیروں کو دو یہ تمہارے لئے اور بھی بہتر ہے اور اس سے تمہارے بعض گناہ دور ہو جائیں گے "(بقر 273۔ نساء40تا43) "زکوٰۃ کا مال صرف محتاجوں اور فقیروں کے لئے ہے اور ان کے لئے جو اس کے وصول کرنے پر مقرر ہیں اور ان کے لئے ہے جن کے دل اسلام کی طرف راغب کرنے منظور ہیں۔ اور گردنوں کے چھڑانے اور قرضداروں اور خرچ جہاد اور مسافروں کے لئے ہے "(توبہ 60)۔ "جو مال اللہ اپنے رسول کو بستیوں والوں سے مفت دلوادے وہ رسول کا اور رسول کے قرابت داروں کا اور یتیموں کا اور محتاجوں اور مسافروں کا حق ہے "(حشر آیت 7) "جو شے تم لوٹ کے لائے ہو اس کا پانچواں حصہ اللہ اور رسول اور رسول کے رشتہ داروں، یتیموں، اور محتاجوں اور مسافروں کے لئے ہے "(انفال ۴۲)۔ "اے محمد تو یتیموں پر ظلم نہ کر اور نہ سائل کو جھڑک "(ضحیٰ 9۔ نیز دیکھو بقر آیت 246و265و274۔ بنی اسرائیل 31 وغیرہ)۔

(3)

جبلّت والدینی کے میدان عمل کے وسعت کے مسئلہ پر غور کرتے وقت یہ لازم ہے کہ اس بات کی جانچ پڑتال کی جائے۔ کہ خیرات کا صحیح مصرف کیا ہے؟ اور کون اس کے مستحق ہیں۔ قرآن اس معاملہ میں ایک نرالی تجویز پیش کرتا ہے کہ زکواۃ کا مال ان لوگوں کے لئے ہے جن کے دل لالچ دے کر "اسلام کی جانب راغب کرنے منظور ہیں "(سورہ توبہ آیت 60)۔ اور خیرات کا مال جہاد کے اخراجات کو برداشت کرنے کے لئے ہے۔ کیا لالچ دے کر مسلمان بنانا اور دشمنوں پر جہاد کرنے کے لئے خرچ کرنا خیرات کو صرف کرنے کا اچھا طریقہ ہے؟ ہر صحیح العقل شخص اس کا جواب نفی میں دے گا۔ اس کے برعکس انجیل میں وارد ہوا ہے "اگر تیرا دشمن بھوکا ہو تو اسے روٹی کھانے کو دے اگر پیاسا ہو تو اسے پانی پینے کو دو" (رومیوں ۱۲: ۲۰) قرآن کہتا ہے کہ خیرات کے مال سے دشمنوں کا قلع قمع کر دے۔ انجیل کہتی ہے کہ خیرات کے مال سے بھوکے پیاسے دشمن جان تک کا پیٹ پال ۔ ناظرین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کون سا مذہب جبلّت والدینی کے میدان عمل کو وسعت دیتا ہے اور اس جبلّت کے لطیف اور نازک جذبات کا بھڑکاتا ہے۔ کونسا مذہب مصیبت زدوں کا رفیق، بدنصیبوں کا شفیق اور کریمانہ اقتضاؤں کا سرچشمہ ہے؟ اسلام یا مسیحیت؟ مسیحیت ہر پہلو سے کریمانہ اور مشفقانہ اقتضاؤں کا منبع ہے۔ چنانچہ انجیل اس بات پر اصرار کرتی ہے کہ جو خیرات رحم اور محبت کے جذبات کے بغیر کی جاتی ہے وہ بے کار اور بے سود ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ اگر کوئی "اپنا سارا مال غریبوں کا کھلا دے اور ان کی خاطر اپنا بدن بھی جلانے کو دے دے۔ لیکن محبت نہ رکھے۔ تو اسے کچھ بھی فائدہ نہیں" (کرنتھیوں ۱۳: ۲۰)۔ قرآن میں اس قسم کی تعلیم مطلق نہیں۔ پس اس نکتہ نگاہ سے بھی اسلام دین فطرت کے معیار پر پورا نہیں اترتا صرف مسیحیت ہی دینِ فطرت کہلانے کی مستحق ہو سکتی ہے۔

(4)

اگر ناظرین ایک دفعہ پھر ان انجیلی آیات کا ملاحظہ کریں۔ جن کا اقتباس بطور مشتے نمونہ از خروارے اس فصل میں کیا گیا ہے۔ تو ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ مسیحیت کے محرکات اور مرغبات اسلام میں مفقود ہیں۔ انجیل جلیل میں سیدنا مسیح نے اپنے آپ کو فقر و مسکنت کا مجسمہ قرار دے دیا اور فرمایا کہ جو لوگ محتاجوں، بیماروں، یتیموں، قیدیوں، بھوکوں، پیاسوں، غریبوں، مظلوموں، بیکسوں، کی خدمت کرتے ہیں۔ وہ خود مسیح کی خدمت کرتے ہیں۔ (متی ۲۵ باب؛ مرقس ۹: ۳۶ وغیرہ)۔ یہ محرکات اسلام میں نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ اسلام تقدیر کے مسئلہ کا قائل ہے۔ تقدیر کا مسئلہ اسلامی عقیدہ کے جزو لاینفک ہے۔ (بنی اسرائیل 14، قمر 49، طلاق 3 وغیرہ) نیکی اور بدی خوشحالی اور مصیبت خدا کی طرف سے آتے ہیں "ہم کو وہی پہنچے گا جو اللہ نے ہمارے لئے لکھا ہے" (توبہ آیت 51)۔ چونکہ ہم نے مسئلہ تقدیر کا ذکر زیادہ تفصیل کے ساتھ اسی رسالہ کی فصل پنجم میں کیا ہے۔ لہٰذا ہم اس پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ کہ علامہ اقبال جیسا شخص یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ

"اس بات کا انکار نہیں کر سکتے کہ تقدیر کا عقیدہ قرآن کے تار و پود میں موجود ہے"۔

(Relegious Thought in Islam p. 103)

اس قسم کے عقیدہ میں کوئی شے ہم کو مصیبت زدوں کی تکلیف دور کرنے لاچاروں کی مدد کرنے اور مظلوموں کی حمایت کرنے کی جانب راغب نہیں کر سکتی۔ اس کے برعکس یہ عقیدہ ان بیکسوں کی جانب سے ہمارے دلوں کو سخت کر دیتا ہے۔ لیکن جو محرکات مسیحیت سے مخصوص ہیں وہ اس امر کے مقتضی ہیں کہ ہم ہر ممکن طور سے ایسے لوگوں کی مدد کرنے پر ہر وقت آمادہ رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لطیف اور نازک جذبات جو والدینی جبلّت سے متعلق ہیں۔ مسیحیت کا جزو لاینفک ہو گئے ہیں کہ منکرین تک کو انکار کی مجال نہیں۔ چنانچہ مشہور ملحد ہکسلے (Huxley) کہتا ہے کہ

"صرف بائبل ہی ابتدا سے دور حاضرہ تک غریبوں اور مظلوموں کے حقوق کے محافظ رہی ہے"۔

مسیحی کلیسیا کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ تمام نازک اور لطیف جذبات جن کا ماخذ والدینی جبلّت ہے۔ مسیحیت کا طغرائے امتیاز رہے ہیں۔ مورخ لیکی ہم کو بتلاتا ہے کہ

> "غلاموں کو آزاد کرنا۔ قیدیوں کی خبر گیری کرنا۔ اسیروں کا فدیہ دینا۔ غربا پروری کرنا۔ سخاوت اور خیرات دینا، خودکشی طفل کشی اور اسقاط حمل کا خاتمہ کرنا۔ حریت اور نفس انسانی کی وقعت کرنا۔ بچوں اور عورتوں کا احترام کرنا۔ اچھوت اقوام سے مساوات کرنا۔ اخوت انسانی کا سبق سکھانا۔ غلاظت اور امراض کی انسداد کے لئے ہسپتال کا کھولنا۔ ظلم بندش بند کرنا۔ کاشتکاروں اور مزدور پیشہ لوگوں سے غلامانہ سلوک کا منع کرنا۔ جہالت کو رفع کرنے کے لئے تعلیم کا انتظام کرنا وغیرہ وغیرہ مسیحیت کے روشن کارناموں میں سے ہیں۔ کیونکہ یہ تمام باتیں کلمتہ اللہ کی تعلیم، زندگی اور نمونہ کا نتیجہ ہیں"۔

ہر زمانہ اور ہر ملک ہر قوم اور ہر ملت میں جہاں جہاں مسیحیت گئی۔ وہاں کلیسیائے نے ان باتوں کو اپنے ذمے لے لیا اور تمام لطیف اور نازک جذبات کا بیج بو کر بنی نوع انسان کی بہبودی اور ترقی کی کوشاں رہی۔ بخلاف اس کے قید اور غلامی۔ عورتوں کی پست حالت بچوں کی جانب سے لاپرواہی اور غفلت تعصب اور جہالت۔ لوٹ مار اور غارت وغیرہ مسئلہ تقدیر کی وجہ سے اسلام کے ہمدوش رہے۔ یہ ایک ایسی روشن حقیقت ہے جس سے کسی مورخ کو انکار کی مجال نہیں ہو سکتی۔ حتیٰ کہ علامہ سر اقبال کو بھی اس امر کا اقبال ہے کہ

"قسمت اور تقدیر کا بدترین پہلو صدیوں سے دنیائے اسلام پر غالب رہا ہے"

صفحہ 104 تا 105۔

نتیجہ

اس فصل میں ہم نے جبلّت والدینی کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی ہے اور جس پہلو سے بھی اسلام پر نگاہ کی ہے۔ وہ دین ِ فطرت نظر نہیں آیا بخلاف اس کے ہم نے دیکھا کہ مسیحیت ہی ایک ایسا واحد مذہب ہے۔ جو والدینی جبلّت کے ہر تقاضا کو بطرز احسن پورا کرتا ہے۔ ماؤں اور بچوں کے حقوق کی نگہداشت کرتا ہے۔ ان حقوق کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں۔ ان کا سدباب کرتا ہے۔ بچوں اور والدین کو ان کی ذمہ داریوں اور ان کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے۔ خدا کی ذات اور خدا اور انسان کے باہمی رشتہ کے متعلق اور بنی نوع انسان کے متعلق ایسی تعلیم دیتا ہے۔ جو جبلّت والدینی کے نہ صرف مطابق ہے بلکہ اس پر مبنی ہے۔ یہی ایک مذہب ہے جو جبلّت والدینی کے میدان عمل کو بیس (۲۰) صدیوں سے مختلف ممالک واقوام میں وسعت دیتا چلا آیا ہے۔ لہٰذا مسیحیت ہی ایک مذہب ہے جو ادیان عالم میں دینِ فطرت کہلانے کا مستحق ہے۔

فصل پنجم

لڑاکا پن اور غصہ کی جبلّت

جنگ جوئی کی جبلّت کی خصوصیات

ہماری فطرت کی جبلّتوں کا یہ تقاضا ہے کہ ان کو پورا کیا جائے۔ اور ان کے پورا کرنے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ مثلاً ماں باپ کی جبلّت اس بات کی خواہاں ہے کہ بچہ کی حفاظت اور پرورش ہو اور انسانی فطرت اس بات پر مجبور ہے کہ وہ اپنے بچہ کی حفاظت کرے اور اس کی حفاظت کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ لیکن جب رکاوٹ حائل ہو جاتی ہے۔ تو یہ ہماری فطرت میں داخل ہے کہ ہم میں غصہ پن اور لڑاکا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ہم اس رکاوٹ کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ پس جب کسی فطرتی اقتضا کی مزاحمت ہوتی ہے۔ تو اس مزاحمت کی وجہ سے غصہ اور لڑاکا پن کی جبلّت کا ظہور ہوتا ہے اور یہ جبلّت اس چیز کو دور اور ختم کر دینا چاہتی ہے۔ جس سے فطرتی اقتضا کے آزادانہ فصل میں رکاوٹ پڑی تھی۔ پس ظاہر ہے کہ اس جبلّت کی برانگیختگی دوسروں کی تحریک پر موقوف ہے۔

(۲)

ایک اور بات قابل غور ہے کہ غصہ کی جبلّت اسی قدر اور اسی نسبت سے شدید ہوتی ہے جس قدر روکے ہوئے اقتضا کی قوت شدید ہوتی ہے مثلاً اگر نر اور مادہ کے تعلقات میں کوئی شے رکاوٹ کا باعث ہے۔ تو غصہ اور لڑاکا پن ہماری طبیعت میں شدت سے پیدا ہو گا۔ ایسی رکاوٹوں کی وجہ سے روز مرہ قتل اور خون کی وارداتیں ہوتی ہیں۔ کم سن بچوں میں اس جبلّت کی برانگیختگی اپنی خالص صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً جب چھوٹے بچوں کی کسی جبلّت کی آزادانہ فعل میں ہم مزاحم (روکنے والا) ہوتے ہیں اور ان کو چھیڑتے ہیں۔ تو وہ برہم ہو کر منہ کھول کر کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔

(3)

مختلف افراد اور اقوام میں اس جبلّت کی طاقت کے اعتبار سے عظیم اختلاف ہے۔ اور تہذیب و نشو و نما سے اس جبلّت کے اظہار کے طریقوں میں تغیر ہو گیا ہے۔ چنانچہ جوں جوں انسان اور اقوام ترقی کرتی ہیں۔ ان میں ضبط کی طاقت بڑھتی جاتی ہے۔ ان کے خیالات وسیع ہو جاتے ہیں۔ اور جنگ جوئی کی جبلّت اپنی خالص عریانی صورت میں ظہور پذیر نہیں ہوتی۔ کیونکہ مزاحمتوں پر غالب آنے کے وسائل زیادہ شائستہ ہو جاتے ہیں۔

(4)

علاوہ ازیں انسانوں اور جماعتوں کی زندگی میں معاشرتی امور کی تکمیل اور نظام جماعت کے لئے رقابت کا جذبہ اس جبلّت کی جگہ کو غضب کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ دنیا کے کاروبار کے دس حصوں میں سے نو حصوں کا کام اسی رقابت سے چلتا ہے۔ مثلاً ہمارا نظام تعلیم رقابت کے جذبے پر مبنی ہے اس کی برکت سے ادبیات اور فنون میں دن بدن اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ چونکہ رقابت کے جذبہ حوصلہ مندی کا اصلی جوہر ہے۔ لہٰذا اس جذبہ کا ظہور جنگجوئی کی جبلّت میں مداخلت کرتا ہے۔ حتیٰ کہ مہذب اشخاص اور جماعتوں میں یہ جبلّت محرک اولیٰ نہیں رہی۔ مبارزت (لڑائی) کا جوش انسانوں اور قوموں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ لیکن رقابت کا جذبہ اضطراب کے ساتھ موافقت رکھتا ہے۔ اور اس کا طبعی رجحان فنا اور بربادی کی بجائے حفاظت کی جانب ہے رقابت کا جذبہ اعلیٰ درجہ کی مہذب جماعتوں کا طغرائے امتیاز ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جنگ جوئی کے عوض محنت اور دانش کی رقابت ہوتی ہے اور سوسائٹی کا رجحان تجارت اور صنعت و حرفت کی رقابت کی طرف ہو جاتا ہے۔

(5)

اگر جنگ جوئی کی جبلّت کا رجحان دیگر جبلّی میلانات کے اغراض کو حاصل کرنے کی جانب راغب کیا جائے۔ تو یہ جبلّت نہایت توانائی کا موجب ہو جاتی ہے۔ اس کے اقتضا کی طاقت دوسری جبلّتوں کی اقتضاؤں کو کمک دیتی ہے اور ان کے ساتھ شریک ہو کر ہم کو اس قدر طاقت دیتی ہے کہ ان اغراض کے حاصل کرنے میں ہم مشکلات پر غالب آجاتے ہیں۔

لڑاکا پن کی جبلّت اور دینِ فطرت کے لوازمات

مذکورہ بالا سطور سے ظاہر ہے کہ دین فطرت کا یہ کام ہے کہ جنگجوئی کی جبلّت کی تربیت کرے تاکہ انسانوں میں یہ جبلّت اپنی خالص عریاں صورت میں مغلوب ہو جائے اور انسانی امور میں ضبط کی طاقت بڑھ جائے تاکہ یہ جبلّت محرک اولیٰ نہ رہے۔ رقابت کا جذبہ اس کی جگہ غضب کر لے۔ دینِ فطرت کا کام ہے کہ اس جبلّت کا رجحان دیگر جبلّی میلانات کے اقتضاؤں کو حاصل کرنے کی جانب راغب کرے تاکہ اقوام اور افراد تباہ و برباد ہونے کی بجائے ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو سکیں۔

مسیحیت اور غصّہ

مسیحیت ہم کو تعلیم دیتی ہے۔ کہ لڑاکا پن اور غصہ کی جبلّت کا اس کی عریانی میں مظاہرہ مت کرو۔ بلکہ ضبط کو کام میں لا کر اپنے جذبات پر قابو حاصل کرو۔ چنانچہ کتاب مقدس میں لکھا ہے کہ "غصہ سے باز آؤ اور غضب کو چھوڑ دے" (زبور ۳۷: ۸)۔ "نرم جواب غصہ کو دور کر دیتا ہے" (امثال ۱۵: ۱) "وہ جو قہر کرنے میں دھیما ہے پہلوان سے بہتر ہے اور وہ جو اپنی روح پر ضابط ہے اس سے بہتر ہے جو شہر کو فتح کر لیتا ہے" (امثال ۱۶: ۳۲)۔ کلمتہ

اللہ نے فرمایا"تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا کہ خون نہ کر لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنے بھائی پر غصہ ہو گا وہ عدالت کی سزا کے لائق ہو گا ۔اگر تو قربان گاہ پر اپنی نذر گزرانتا ہے اور وہاں تجھے یاد آئے کہ میرے بھائی کو مجھ سے کچھ شکایت ہے۔تو اپنی نذر قربان گاہ کے آگے چھوڑ دے اور جا کر پہلے اپنے بھائی سے ملاپ کر "(متی ۵: ۲۱)۔پولوس رسول فرماتے ہیں"ہر طرح کی تلخ مزاجی اور قہر اور غصہ تم سے دور ہو جائیں" (افسیوں ۴: ۳۱)۔"انتقام نہ لو بلکہ غصہ کی راہ چھوڑ دو بدی سے مغلوب نہ ہو بلکہ نیکی کے ذریعہ بدی پر غالب آؤ"(رومیوں ۱۲: ۱۹)۔مقدس یعقوب فرماتے ہیں "اے میرے پیارے بھائیوں ہر آدمی غصے میں دھیما ہو کیونکہ انسان کا غصہ خدا کی راستبازی کا کام نہیں کرتا"(یعقوب ۱: ۱۹)۔پس ظاہر ہے کہ مسیحیت غصہ اور جنگجوئی کی جبلّت کو اس کی عریاں حالت میں ظاہر ہونے سے روکتی ہے اور اس پر قابو پانے کی تلقین کرتی ہے۔

(۲)

ہم اوپر بتلا چکے ہیں کہ ہماری طبیعت میں غصہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہماری فطرت کی کسی جبلّت کے فطرتی اقتضا کے پورا ہونے میں مزاحمت اور رکاوٹ ہو اس غصہ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس رکاوٹ کو دور کر دے اور مزاحمت کا خاتمہ کر دے۔پس اگر غصہ کا مقصد نیک ہو گا تو غصہ جائز ہو گا لیکن اگر اس کا مقصد منشائے الٰہی کے خلاف ہو گا تو غصہ ناجائز اور ممنوع ہو گا۔مسیحیت جائز غصہ کے خلاف نہیں۔مثلاً جب کوئی کسی قابل رحم انسان کو دیکھ کر اس کی لاچاری سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہے یا اس کی مظلومیت کو دیکھ کر محبت ،رحم ،ترس اور ہمدردی کی بجائے سخت دلی اور ظلم کا اظہار کرے۔تب ہم جائز طور پر اس سے غصہ ہو سکتے ہیں۔مثلاً گذشتہ فصل میں ہم نے دیکھا تھا کہ منجی عالم کے دشمن ایک شخص کو جس کا ہاتھ سوکھا ہوا تھا نہیں چاہتے تھے کہ وہ سبت کے روز شفا پائے تو آپ نے "ان کی سخت دلی کے سبب غمگین ہو کر چاروں طرف ان پر غصہ سے نظر " کی اور بیمار کو تندرست کر دیا۔اگرچہ آپ کے حق میں اس کا نتیجہ صلیبی موت ہی ہوا(مرقس ۳: ۶۶)۔آپ کی جبلّت والدینی کے استعمال میں آپ کے دشمنوں کی سخت دلی مزاحم تھی۔اسی طرح ایک دفعہ جب آپ کے رسولوں نے بچوں کی تحقیر کی تو آپ یہ "دیکھ کر خفا ہوئے "(مرقس ۱۰: ۱۴)۔کیونکہ وہ اسی جبلّت کے اقتضا کے پورا ہونے میں مزاحم ہوئے۔کسی بیمار کمزور اور لاچار ہستی کو دیکھ کر اس کے ساتھ ترس ،رحم ،ہمدردی اور محبت کے ساتھ پیش آنے کی بجائے اس سے لاپروائی ، تحکم ،سخت دلی اور بے رحمی سے پیش آنا خدا کے منشا کے مطابق نہیں ایسے حالات کی وجہ سے کلمتہ اللہ نے فرمایا ہے کہ "ان چھوٹوں میں سے ایک کو ٹھوکر کھلانے کی نسبت یہ بہتر ہوتا ہے کہ ٹھوکر کھلانے والے کے گلے میں چکی کا پاٹ لٹکایا جاتا اور وہ سمندر میں پھینکا جاتا" (لوقا ۱۷: ۲) آپ نے فقیہوں اور فریسیوں کو بار بار متنبہ فرمایا کہ بیواؤں اور یتیموں پر ظلم کرنے سے احتراز کریں(لوقا ۲۰: ۴۷)۔آپ نے تمثیلوں کے ذریعہ غربا پروری پر زور دیا(لوقا ۱۶ باب)۔جب آپ نے دیکھا کہ خدا کے گھر میں غریب عبادت گذاروں کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں۔تو آپ ان سے جو آپ کی جان کے لیوا تھے نہایت خفا ہوئے اور اس برائی کا دور کرنے کی خاطر آپ نے اپنی جان عزیز کو خطرہ میں ڈال دیا۔ (مرقس ۱۱: ۱۷۔۱۸)۔ آپ کا غصہ آپ کی محبت اور ہمدردی کا ظہور تھا۔کیونکہ آپ کی محبت اس بات کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔کہ کمزور اور مظلوم ہستیوں کو تباہ اور برباد کیا جائے۔جب آپ کے دشمنوں نے آپ کی ذات مبارک پر ظلم کیا۔تو آپ نے صبر اور محبت سے ان کے ظلم کی برداشت کی۔جب انہوں نے آپ کو مصلوب کیا تو آپ کے منہ سے ان کے لئے دعائے خیر ہی نکلی۔لیکن آپ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ دوسروں پر ظلم اور جبر روا رکھا جائے جب

آپ دوسروں پر ظلم ہوتا دیکھتے تو آپ کی محبت جوش زن ہوتی اور آپ ظالموں پر اپنا راست غصہ ظاہر کرتے۔ بعض حالات مسیحیت نے غصہ کو جائز قرار دیا ہے لیکن یہاں بھی قید لگادی ہے۔ چنانچہ مقدس پولُس رسول فرماتے ہیں کہ "غصہ تو کرو مگر غصہ کے دوران گناہ نہ کرو" (افسیوں ۴: ۲۶)۔ ایسا غصہ جس میں گناہ کی آلائش نہیں مسیحیت نے جائز قرار دیا ہے کیونکہ وہ دلی محبت کا اظہار ہے اور انسان کی بربادی اور تباہی کی بجائے حفاظت اور نگہبانی کا کام کرتا ہے۔ ایسے حالات میں "انسان کا غصہ خدا کی ستائش کا باعث ہوتا ہے" (زبور ۷۶: ۱۰)۔

غصّہ کی جبلّت اور قصاص

اس قسم کے غصہ میں اور انتقام کے غصہ میں بعد المشرقین ہے۔ انجیل جلیل میں بدلہ، قصاص، اور انتقام کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ کلمتہ اللہ نے فرمایا "تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے" (متی ۵: ۳۸)۔ "اگر تم آدمیوں کے قصور معاف کروگے تو تمہارا آسمانی باپ بھی تم کو معاف کرے گا اور اگر تم آدمیوں کا قصور معاف نہ کروگے تو تمہارا باپ بھی تمہارے گناہ معاف نہ کرے گا" (متی ۶: ۱۴؛۱۸: ۲۱؛۱۸: ۳۵؛ مرقس ۱۱: ۲۵؛ لوقا ۱۷: ۴ وغیرہ)۔ ابن اللہ نے تمثیلوں کے ذریعہ یہ حقیقت اپنے مقلدین (پیروی کرنے والوں) کے ذہن نشین کی۔ کہ حقیقی مذہب کا مطلب ہی یہ ہے کہ حقیقی اخوت کا اندرونی احساس ہو اور یہ کہ بیرونی باتیں مثلاً نماز کی ادائیگی، خیرات کا دینا وغیرہ، اس اندرونی عفو کے احساس اور محبت کے بغیر بے معنی باتیں ہیں (متی ۱۸: ۲۳)۔ آپ نے اپنی زندگی اور نمونہ سے دشمنوں کو معاف کرنے کا سبق سکھایا۔ حتیٰ کہ جب آپ کے خون کے پیاسے آپ کو مصلوب کررہے تھے اور آپ ان کے دل کو پاش پاش کرنے والے تمسخر اور طعن و تشنیع کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ آپ نے ان کو اس جانکنی کی حالت میں بھی دعائے خیر دی اور کہا "اے باپ ان کو معاف کر کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ وہ کیا کررہے ہیں" (لوقا ۲۳: ۳۴)۔ اس کے برعکس جب رسول عربی کے حقیقی چچا ابولہب اور اس کی بیوی نے آپ کو ستایا تو آپ نے ان کے حق میں بددعا کی (سورہ لہب)۔ جناب مسیح کے عفو اور محبت کے نمونے نے دنیا کو ایسا موہ لیا ہے کہ اب بنی نوع انسان کسی ایسے شخص کو حقیقی معنوں میں جلیل القدر ماننے کو تیار نہیں جو آپ کے عفو کے نمونہ کو اختیار نہیں کرتا۔ حق تو یہ ہے کہ کلمتہ اللہ نے عفو اور محبت کا نمونہ صلیب پر ہی نہیں دکھایا۔ بلکہ آپ کی تمام زندگی کا ایک ایک دن دشمنوں کے طعنوں کو سننے اور ان کو معاف کرنے میں گذرتا تھا (۱۔ پطرس ۴: ۱۳)۔ ایک آپ کو کافر اور دروغگو کہتا (مرقس ۲: ۷)۔ دوسرا آپ کو پاگل اور دیوانہ بتلاتا۔ تیسرا کہتا کہ آپ پیٹو اور شرابی ہیں۔ کوئی کہتا تھا کہ آپ نے ناپاک شیطانی روح کے ساتھ ساز باز کر رکھی ہے۔ کوئی آپ کو گنہگاروں کا یار کہہ کر پکارتا غرضیکہ آپ کو ہر طرح سے "بے عزت" کیا جاتا تھا۔ (مرقس ۶: ۴) لیکن آپ رحم اور محبت مجسم تھے۔ آپ نے انہی دشمنوں کو ہر طرح کی بیماری اور بلا سے شفا بخشی۔ ان سے انتقام لینے کے بجائے ان کو اپنی جاودانی محبت کے کرشمے معجزات کی صورت میں دکھائے اور ان کے جسم اور روح دونوں کو نجات بخشی۔ کلمتہ اللہ کی نظر میں دشمنوں کے جگر خراش طعنے یہ ثابت کرتے تھے کہ ان کی روحیں اور ان کے ذہن شیطان کے قبضہ میں ہیں۔ جس کے پنجہ سے چھڑانے کی خاطر آپ اس دنیا میں آئے تھے۔ پس آپ نے بدی کے عوض بدی نہ کی بلکہ ہر ایک سے نیکی کے ساتھ پیش آئے۔ انجیل

جلیل کی تعلیم آپ کے نمونہ کا عکس ہے۔ چنانچہ وارد ہوا ہے کہ " اے عزیزو! انتقام نہ لو بلکہ اگر تیرا دشمن بھوکا ہے تو اس کو کھانا کھلا اگر پیاسا ہے تو اسے پانی پلا بدی سے مغلوب نہ ہو بلکہ نیکی کے ذریعہ بدی پر غالب آ" (رومیوں ۱۲: ۱۹؛۱۔ تھسلنکیوں ۵: ۱۵؛امثال ۲۴: ۲۹ وغیرہ)۔ کلمتہ اللہ نے قصاص کے معاملہ میں ایک زرین اصول بنی نوع انسان کے سامنے پیش کیا اور فرمایا۔ کہ جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں تم بھی وہی ان کے ساتھ کرو (متی ۷: ۱۲)۔ آپ نے حکم دیا" اپنے دشمنوں سے محبت کرو اپنے ستانے والوں کے لئے دعا کرو۔ تا کہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے بیٹے ٹھہرو" (متی ۵: ۴۴؛لوقا ۶: ۲۷؛۱۔ کرنتھیوں ۴: ۱۲؛خروج ۲۳: ۴ وغیرہ)۔

(۲)

اس تعلیم کے خلاف اسلام و قرآن قصاص اور انتقام کی تعلیم دیتا ہے۔ "مومنو۔ مقتولوں کا قصاص تم پر فرض کیا گیا ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد۔ غلام کے بدلے غلام۔ عورت کے بدلے عورت اے عقل مندو! قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے "(بقر آیت 173 تا 175)۔ "جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کرو۔ جیسے اس نے تم پر زیادتی کی "(بقر 190۔ مائدہ 49)۔ "جو تم بدلہ دو تو اتنا ہی بدلہ دو جس قدر تم کو تکلیف پہنچی ہے اور جو تم صبر کرو تو صبر صابروں کے لئے خوب ہے (نحل ۱۲۷)" جو اللہ کے پاس ہے۔ وہ ایمانداروں اور ان کے لئے جو اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ "بہتر اور پائیدار ہے۔ اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو وہ معاف کر دیتے ہیں۔ اور جب ان پر زیادتی ہوتی ہے تو وہ بدلہ لیتے ہیں اور بدی کا بدلہ اسی کی مانند بدی ہے۔ پھر جس نے معاف کیا اور صلح کی تو اس کا اجر اللہ پر ہے۔ جو کوئی ظلم سہنے کے بعد بدلہ لے گا۔ تو ان پر کوئی راہ ملامت نہیں ہے (شوریٰ 34 تا 38)۔

(3)

بیسویں صدی کے آغاز میں قصاص کی تعلیم کی وجہ سے اسلام کو دینِ فطرت کہا جاتا تھا اور مسیحیت کی تعلیم کو خلافِ فطرت قرار دیا جاتا تھا۔ لیکن خود ہندوستان میں ہمارے غیر مسیحی ہم وطنوں نے گذشتہ بیس (۲۰) سالوں میں مسٹر گاندھی کی زیر قیادت ستیہ گرہ (حکومت کے خلاف پر امن تحریک) کی تحریک کے دوران میں سیدنا مسیح کی اس تعلیم پر عمل پیرا ہو کر نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا جہان پر یہ ثابت کر دیا کہ کلمتہ اللہ کی یہ تعلیم نہ صرف قابل عمل ہے بلکہ یہی ایک واحد طریقہ ہے جس سے مغلوب غالب پر حقیقی فتح حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ لاہور کے مولانا ظفر علی خان کے اخبار زمیندار نے اسی مضمون پر اپنے ایک مقالہ میں ذیل کے پر زور الفاظ رقم کئے ہیں

> "محکوموں کے پاس ضبط اور انضباط (پیوستگی، ڈھنگ، ضابطہ) کے ساتھ ایثار و قربانی کی متحدہ طاقت کا مظاہرہ ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے آگے بڑی سے بڑی جاہ و جلال اور غرور والی حکومت گھٹنے ٹیک دیتی ہے۔ اور نیاز مندانہ دست بستہ محکوموں کے آگے کھڑی ہو کر ان کی آرزؤں کو پورا کرنا تخت و تاج کی بقا کے لئے ضروری سمجھتی ہے"

(17نومبر 1929ء)

پس کٹر سے کٹر مخالفین مسیحیت بھی اب تجربہ کرنے کے بعد اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ تعلیم عین فطرت کے مطابق ہے۔ کیونکہ جیسا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ جوں جوں انسان اور اقوام ترقی کی طرف گامزن ہوتے جاتے ہیں۔ ان میں ضبط کی قوت بڑھتی اور قصاص کا مادہ زائل ہوتا جاتا ہے۔ اور مزاحمتوں پر غالب آنے کے وسائل زیادہ شائستہ ہوتے جاتے ہیں۔ پس قصاص کی خواہش یہ ثابت کرتی ہے کہ انتقام چاہنے والے کی طبیعت اس کی حقیقی فطرت سے کوسوں دور چلی گئی ہے اور کہ اس کی نشوونما الٰہی منشا کے مطابق نہیں ہوئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نیکی کے ذریعہ بدی پر غالب آنے کی اور برا کہنے والوں کو دعا دینے کی اور انتقام کے عوض معاف کرنے کی تعلیم ایسی طبیعت رکھنے والوں کے لئے مشکل ہے لیکن اس کا صحیح علاج یہ نہیں کہ تعلیم کو کوسا اور خواہ مخواہ خلاف فطرت کہا جائے، بلکہ صحیح علاج یہ ہے کہ طبیعت کو سدھارا جائے تاکہ وہ اپنی اصلی فطرت پر آجائے۔ خود قرآن عفو اور برداشت کو "احسن بات" قرار دیتا ہے۔ اور ہم کو بتلاتا ہے کہ بہشت میں کینہ اور بغض ایمانداروں کے دلوں میں سے نکال دیئے جائیں گے۔ (اعراف 41۔ حجر 47) جس سے صاف ظاہر ہے کہ کینہ بغض اور قصاص کی خواہش بہشتی اوصاف نہیں۔ یعنی وہ الٰہی منشا اور انسانی فطرت کے خلاف ہیں۔ لیکن عفو بخشش اور محبت کے اوصاف خدا کے ارادہ اور انسانی سرشت اور فطرت کے مطابق ہیں۔

پس قصاص کی قرآنی تعلیم ثابت کرتی ہے کہ اسلام درحقیقت دین فطرت نہیں۔ اور عفو اور محبت کی انجیلی تعلیم ہی دراصل فطرت کے مطابق ہے۔

(ا)

لڑاکا پن کی جبلّت اور جہاد کی تعلیم

اسلام میں لڑاکا پن کی جبلّت اپنی خالص عریانی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں حکم ہے "مسلمانو! جنگ کفار کے لئے جس قدر تم سے ہو سکے۔ قوت اور گھوڑے باندھنے کی تیاری کرو۔ تاکہ ایسا کرنے سے تم اپنے دشمنوں اور خدا کے دشمنوں کو ڈراؤ اور ان کے سوا تم اور لوگوں کو بھی ڈراؤ" (انفال آیت 62)۔ "اے نبی مسلمانوں کو لڑائی پر ابھارو۔ تم میں سو ہوں تو ہزار کافروں پر غالب ہوں گے" (انفال 66)۔ مسلمانو ہلکے اور بوجھل ہو کر نکلو اور اپنی جان ومال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو (توبہ 41)۔ "اے نبی کافروں اور منافقوں سے لڑائی کر اور ان پر سختی دکھلا۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے" (توبہ 74۔ تحریم 9)۔ "مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو اور پکڑو اور گھیر و اور ہر گھات کی جگہ میں ان کے لئے بیٹھو" (توبہ 5)۔ "جب تم کافروں سے بھڑو۔ تو ان کی گردنیں مارو یہاں تک کہ تم ان میں خوب خونریزی کر چکو۔ تب ان کی مشکیں باندھو" (محمد 4، بقر 245، صف 4، توبہ 19و112، نساء 91، توبہ 5و111، انبیاء 112، حج 40تا44و54و77، توبہ 24، 21و121، طور 47، سجدہ 21، عنکبوت 5، نمل 205، مومنون 95و97، نسا 76، مائدہ 59، نساء 73تا83و96تا97وغیرہ وغیرہ)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض مسلمانوں کو لڑاکا پن کی جبلّت کا مظاہرہ اس کی خالص صورت میں بہت برا معلوم ہوا۔ لہٰذا قرآن ایسے اشخاص کو تادیب دیتا ہے اور کہتا ہے کہ قتال تم پر فرض ہوا۔ اور وہ تم کو برا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن شاید تم کسی چیز کو برا سمجھو اور وہ

تمہارے لئے بہتر ہو۔ اور شاید تم کسی چیز (یعنی صلح اور محبت وغیرہ) کو پسند کرو۔ اور وہ تمہارے حق میں بری ہو۔ خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے (بقر ۲۱۲)"پس تم اے مسلمانو! ان کافروں کو یہاں تک قتل کرو کہ فتنہ (یعنی غلبہ کفر) نہ رہے۔ اور سراسر خدا کا دین ہو جائے" (انفال 40)۔

کوئی کہاں تک قرآنی آیات کا اقتباس کرتا جائے۔ جن میں حکم ہے کہ لڑاکا پن اور غصہ کی جبلّت کا اس کی عریانی صورت میں مظاہرہ کیا جائے اسلام نے خدا اور مذہب کے نام پر جنگ و قتال کو جائز قرار دیا ہوا ہے۔ آیات کی آیات اور سورتوں کی سورتیں جہاد کے آداب واحکام، جنگ وجدل، اسیر عورتوں کی قسمت، مال غنیمت کی تقسیم، قتل وغارت کے ذکر سے بھری پڑی ہیں۔ مسلمانوں کو اس کام پر ابھارنے کے لئے جو بہترین محرکات ومرغبات قرآن کو ملے۔ وہ اس جہان میں اسیر عورتیں اور مالِ غنیمت ہے اور اس جہان میں نعمائے بہشت یعنی شراب اور حور وغلمان ہیں۔

(۲)

جہاد کے متعلق قرآنی آیات اس قدر کثرت اور صراحت ووضاحت سے وارد ہوئی ہیں۔ کہ بیسویں (۲۰) صدی کے مصلحین اسلام کو بڑی دقت پیش آگئی ہے۔ ان مصلحین نے انجیل جلیل سے محبت کا سبق سیکھ لیا ہے۔ اب ان کی یہ کوشش ہے کہ قرآن کی زبان سے بھی محبت کا سبق نکلوائیں۔ لہٰذا تمام قرآن کو تلاش کرنے کے بعد ایک آیت ان کے ہاتھ لگی۔ جس میں مرقوم ہے "دین میں زبردستی نہیں" (بقر 257)۔ اس آیت کا سہارا لے کر وہ اس بات کو پیش کرتے ہیں۔ کہ اسلام دین کے معاملہ میں جبر کو روا نہیں رکھتا۔ لیکن تاریخ اسلام ہم کو بتلاتی ہے کہ یہ آیت جنگ بدر سے پہلے کی آیت ہے۔ جو مابعد کے قرآنی احکام دربارہ جہاد سے منسوخ ہوگئی۔ چنانچہ حسینی کہتا ہے کہ

"حکم ایں آیت بآیت قتال منسوخ است"

شاہ ولی اللہ بھی حجتہ البالغا باب 73 میں یہی کہتے ہیں۔

"بعض مصلحین یہ کہتے ہیں کہ قرآن کی رو سے مخالفین اسلام کو منکر اسلام ہونے کی وجہ سے قتل کرنا جائز نہیں"۔

اس خیال کے جواب میں ہم ان کو عنان توجہ مندرجہ بالا آیات قرآنی کی طرف منعطف (مُڑنے والا) کرتے ہیں اور ان سے درخواست کرتے ہیں۔ کہ وہ ان کو خالی الذہن ہو کر پڑھیں اور خود فیصلہ کریں کہ ان کا عذر کہاں تک معقول ہے۔ بعض یہ عذر کرتے ہیں کہ آیات جہاد کا تعلق اپنی حفاظت کے ساتھ ہے۔ لیکن قرآنی آیات کے الفاظ اور کتب احادیث وسیر اور اسلامی تاریخ سب کے سب اس کو عذر لنگ (غلط اور لغو عذر) قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ طبری اپنی کتاب میں ہم کو بتلاتا ہے کہ

"جب محمد ﷺ دیکھتے کہ آپ کے احکام کو کفار رد کرتے ہیں۔ اور وہ آپ کی نسبت بدظن ہیں اور برضا ورغبت خود دین اسلام میں داخل ہو کر خدا کے فضل سے فیض یاب نہیں ہوتے۔ تو آپ کو ان کی زبردستی دینِ حق میں داخل کر لیتے"

یہاں طبری وہی لفظ "اکراہ" استعمال کرتا ہے جو آیت "لااکراہ فی الدین" میں آیا ہے۔ اسلامی شریعت دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ یعنی دارلاسلام اور دارالحرب۔ دارالاسلام ودارالحرب سے اس وقت تک لڑے گا جب تک اس میں ایک شخص بھی زندہ رہے گا۔ اور ساری دنیا دارالاسلام میں داخل نہ ہو گی مصلحین اسلام کے لئے ایک ہی راہ فرار ہے کہ وہ مرزا قادیانی کی طرح قرآنی احکام جہاد وغیرہ کو منسوخ قرار دے دیں۔ اور یہ کہہ دیں کہ یہ آیات ان وقتی احکام میں سے ہیں۔ جن کی اب ضرورت نہیں رہی۔ ورنہ قرآن تو اس بات پر مصر (اصرار کرنے والا) ہے کہ "مسلمانوں سے اللہ نے ان کی جانیں اور مال بعوض بہشت خرید لی ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں۔ پھر مارتے ہیں اور مرتے ہیں" (توبہ ۱۱۲)۔

انجیل میں بھی ہے کہ مسیح نے ہماری جانیں اپنا خون بہا کر اور اپنی بیش قیمت زندگی کو نثار کر کے خرید لی ہیں (اعمال ۲۰: ۲۸)۔ لیکن دونوں خریداروں کے مقاصد میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ قرآن میں اللہ نے جانیں خریدی ہیں تاکہ مسلمان لڑیں، ماریں اور مریں۔ لیکن مسیح نے اس مقصد سے خریدی ہیں تاکہ خون خریدہ "اپنے بدن سے خدا کا جلال ظاہر کرے" (۱۔ کرنتھیوں ۶: ۲۰)۔ اور "مسیح کا غلام ہو کر آدمیوں کا غلام نہ بنے" (۱۔ کرنتھیوں ۷: ۲۳)۔ یہ جہاد بالنفس ہے۔ "ہم اگرچہ جسم میں زندگی گزارتے ہیں مگر جسم کے طور پر لڑتے نہیں۔ اس لئے کہ ہماری لڑائی کے ہتھیار جسمانی نہیں۔ ہم ہر ایک خیال کو قید کر کے مسیح کا فرمانبردار بنا دیتے ہیں" (۲۔ کرنتھیوں ۱۰: ۳)۔

(3)

مسیحیت اس جبلّت کی اقتضا کو انسان کی روحانی ترقی کو تکمیل تک پہنچانے میں مدد لیتی ہے۔ تاکہ بنی نوع انسان شیطان اور نفس کے ساتھ جنگ کر کے ان پر غالب آئیں۔ چنانچہ انجیل شریف میں وارد ہے۔ "ایمان کی اچھی کشتی لڑ اور ہمیشہ کی زندگی پر قبضہ کر لے" (۱۔ تیمتھیس ۶: ۱۲؛ یعقوب ۴: ۷ وغیرہ)۔ ہماری لڑائی کے ہتھیار جسمانی نہیں۔ بلکہ خدا کے نزدیک قلعوں کو ڈھا دینے کے قابل ہیں۔ چنانچہ ہم تصورات اور ہر ایک اونچی چیز کو جو خدا کی پہچان کے برخلاف سر اٹھائے ہوئے ہے ڈھا دیتے ہیں۔ اور ہر ایک خیال کو قید کر کے مسیح کا فرمانبردار بنا دیتے ہیں (۲۔ کرنتھیوں ۱۰: ۴؛ ۱۔ پطرس ۵: ۸؛ افسیوں ۴: ۲۷؛ ۱۔ تیمتھیس ۱: ۱۸ وغیرہ)۔ "خداوند میں اور اس کی قدرت کے زور میں مضبوط بنو۔ خدا کے سب ہتھیار باندھ لو۔ تاکہ تم ابلیس کے منصوبوں کے مقابلے میں قائم رہ سکو۔ کیونکہ ہم کو خون اور گوشت سے کشتی نہیں کرنی۔ بلکہ شرارت کی روحانی فوجوں سے اس واسطے تم خدا کے سارے ہتھیار باندھ لو۔ پس سچائی سے اپنی کمر کس کر اور راست بازی کا بکتر لگا کر اور پاؤں میں صلح کی خوش خبری کی تیاری کے جوتے پہن کر اور ان سب کے ساتھ ایمان کی سپر لگا کر قائم رہو۔ جس سے تم اس شریر کے سارے جلتے ہوئے تیروں کو بجھا سکو۔ نجات کا خود اور روح کی تلوار جو خدا کا کلام ہے لے لو" (افسیوں ۶: ۱۰)۔ پس مسیحیت جنگ جوئی کی جبلّت کے اقتضا کو روحانی ترقی کے حصول کے لئے استعمال کرتی ہے۔ امریکہ کا مشہور عالم نفسیات پروفیسر جیمس کیا خوب لکھتا ہے کہ

"دنیا کو جنگ کی ضرورت نہیں بلکہ جنگ کے اخلاقی مترادف کی ضرورت ہے"۔

پس مسیحیت اس جبلّت کی رجحان کو ایسے مقصد کی جانب راغب کرتی ہے جو منشائے الٰہی کے مطابق ہے۔ اور اس جبلّت کی فطرت کا حقیقی تقاضا ہے۔ اور یوں دینِ فطرت کی صلاحیت رکھنے کا ثبوت دیتی ہے۔

مسیحیت اور رقابت کا جذبہ

انسانی معاشرت کی تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ جوں جوں اقوام ترقی کرتی ہیں ضبط کی قوت بڑھ جاتی ہے۔ اور رقابت کا جذبہ انسانوں اور جماعتوں کی زندگی میں جنگ جوئی کی جبلّت کی جگہ غضب کرلیتا ہے۔ مسیحیت نے رقابت کے جذبہ کو بھی انسان کی روحانی ترقی کے حصول کی خاطر استعمال کیا اور یوں دین فطرت ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ مقدس پولُس فرماتا ہے "کیا تم نہیں جانتے کہ میدان میں دوڑنے والے دوڑتے تو سب ہی ہیں۔ مگر انعام ایک ہی لے جاتا ہے تم بھی ایسے ہی دوڑو کہ جیتو۔ ہر پہلوان سب طرح کا پرہیز کرتا ہے۔ وہ لوگ مرجھانے ولا سہرا پانے کے لئے یہ کرتے ہیں مگر ہم اس سہرے کے لئے کرتے ہیں جو نہیں مرجھاتا" (۱۔ کرنتھیوں ۹: ۲۵)۔ "آؤ ہم ہر ایک بوجھ اور اس گناہ کو جو ہمیں آسانی سے الجھالیتا ہے۔ دور کر کے صبر سے دوڑیں جو ہمیں درپیش ہے" (عبرانیوں ۱۲: ۱؛ گلتیوں ۲: ۲؛ ۵: ۷؛ فلپیوں ۲: ۱۶ وغیرہ)۔

لڑاکا پن کی جبلّت اور بنی نوع انسان کی بہبودی کے لیے مسیحی اور اسلامی مساعی

اس فصل کے شروع میں ہم لکھ آئے ہیں۔ کہ اگر غصہ اور جنگ جوئی کی جبلّت کا رجحان دیر جبلّی میلانات کے اغراض کے حصول کی جانب راغب کیا جائے۔ تو یہ جبلّت نہایت کار آمد ثابت ہوتی ہے۔ دینِ فطرت کا یہ کام ہے کہ اس جبلّت کی اقتضا کی توانائی کے ذریعہ دوسری اقتضاوں کے حاصل کرنے میں جو مشکلات سدراہ ہوتی ہیں۔ ان پر ہم غالب آجائیں۔ مسیحیت اس اقتضا کو بنی نوع انسان کی فلاح و بہبودی کے لئے استعمال کرتی ہے۔ تاکہ انسانی ترقی کی راہ میں جو رکاوٹیں حائل ہیں۔ وہ دور ہو جائیں اور خدا کی بادشاہت دنیا میں قائم ہو جائے۔ مسیحیت ہی کا یہ طغرائے امتیاز ہے کہ جہاں وہ غربت، افلاس، ناپاکی، پلیدگی، بدی، شرارت، غلاظت، بیماری، جہالت، قبیح رسوم، یا برے رواج وغیرہ کو دیکھتی ہے۔ وہ اس جبلّت کی اقتضا کا استعمال کرکے ان برائیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیتی ہے۔ مسیحی سکول، ہسپتال، انجمنیں، مجالس۔ بین الاقوامی مظاہرے ان کا قلع قمع کرنے کے لئے صف آرا ہو جاتے ہیں۔ اور منظم طور پر ان کو شکست دینے کے لئے جہاد کرتے ہیں۔ ہندوستان کی اچھوت ذاتوں میں چین و جاپان کے بھوت پریت ماننے والوں میں افریقہ کی خونخوار اور مردم خور وحشی اقوام میں غرضیکہ مسیحیت نے روئے زمین کی ادنیٰ ترین مفلس ترین، حقیر ترین، رذیل ترین اقوام کو ہر ممکن طور پر اور ہر پہلو سے بہتر بنانے کی کوشش کی۔ صرف مسیحیت کی مساعی جمیلہ کی وجہ سے دنیا اور بالخصوص ہندوستان ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے۔ یہ ایک ایسی روشن حقیقت ہے جس سے کسی صاحب کو انکار کی مجال نہیں۔ چنانچہ مسٹر ایم سی راجہ نے گذشتہ سال اسمبلی میں اچھوت ادھار بل پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

"جنوبی ہند میں اول اول مسیحی کلیسیا کے مشن سکولوں نے اچھوت ذات کے طالب علموں کو مساعی اور برابر حقوق عطا کئے"۔

ہندو دھرم ہزاروں سالوں سے ہندوستان میں چلا آیا ہے۔ لیکن اس نے اچھوتوں کو مساوی حقوق نہ دیئے۔ چنانچہ مسٹر ایم کے منشی نے ہندو ینک مین ایسو سی ایشن کے خطبہ صدارت میں کہا

" اچھوت کا تعلق ایک خاص نظام سے متعلق ہے۔ چونکہ ہم اس نظام کی فضا میں رہتے ہیں۔ لہٰذا ہم اچھوت کے گھنونے پن کو بخوبی محسوس نہیں کرسکتے۔ اس نظام کا تعلق سوسائٹی کی درجہ بندی کے ساتھ ہے۔ جو صدیوں سے ہمارے ملک میں رائج ہے۔ اس نظام کے مطابق کروڑوں آدمی اور عورتیں انسان کہلانے کے مستحق نہیں۔ یہ نظام انسانیت کے عین متضاد ہے۔ اور اس مجرمانہ سلوک کا ذمہ دار ہے۔ جو انسان اپنے بھائی انسان کے ساتھ سالہاسال سے کرتا چلا آیا ہے۔ ایسے نظام کا تعلق وحشیانہ زمانہ کے ساتھ ہے۔ لیکن ہم دور حاضرہ میں ایک نئی دنیا میں بستے ہیں۔ اب افراد کی قدر اور منزلت بہ حیثیت افراد کے ہوتی ہے۔ انسان کسی دوسرے مقصد کی خاطر آلہ کار نہیں بنایا جاسکتا۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان ایک توانا اور قومی قوم بن جائے۔ جو شخص اچھوت کا عامی ہے۔ وہ قوم کا دشمن ہے۔ اور دور حاضرہ میں رہنے کے لائق نہیں۔ اگر ہندو دھرم چھوت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ہے اور اگر اس کے شاستروں کے مطابق اچھوت دیوتاؤں کا درشن بھی نہیں کرسکتے۔ تب ہندو دھرم کے زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ کیونکہ وہ مذہب جس کی بنیاد انسانوں کے امتیاز پر ہے۔ در حقیقت تمام مقدس پاکیزہ لطیف تصورات اور جذبات کے منافی ہے"۔

934)ا(Trilume Feb 26

مسٹر گاندھی نے جنوبی ہند میں دورہ کرتے وقت کہا کہ

"کسی شخص کو مسیحی اچھوت کہنا اجتماع الضدین ہے"۔

گذشتہ سال نواب ذوالقدر جنگ بہادر وزیر حضور نظام نے ایک تقریر کے دوران میں کہا

" حضور نظام کی سرکار نے اپنی تمام رعایا کو ایک ہی نظر سے دیکھا ہے اور اس بات کی ہمیشہ خواہشمند رہی ہے۔ کہ ہر شخص کو یکساں طور پر موقعہ دیا جائے"۔

لیکن آپ خیال کر سکتے ہیں کہ سرکار نظام کے لئے اچھوت ذاتوں کے حق میں ہندوؤں کے نکتہ نگاہ نے مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ کیونکہ مذہبی امور میں مداخلت کرنا سرکار کے اصول کے خلاف ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ ہم ان بیچاروں کی طرف سے لاپروا نہیں رہے۔ اور حتی الامکان ان کے خیر خواہ رہے ہیں۔ تاہم در حقیقت مسیحی مبلغین کی مساعی جمیلہ ان کی موجودہ ترقی کی ذمہ دار ہیں۔ ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد کے نکتہ نگاہ میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ وہ بھی مسیحیت کے مشنریوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ خواہ ہم اس حقیقت کو پسندیدگی سے دیکھیں یا ناپسند کریں۔ ہم کو اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اور اس میں رتی بھر شک نہیں۔ کہ مستقبل زمانہ کے مورخین مسیحیت کے مبشروں اور مبلغوں کے مساعی کا جو انہوں نے بنی نوع انسان کی ترقی کی خاطر کی ہیں۔ نہایت پرزور الفاظ میں ذکر کریں گے۔ (Guardian Feb/8/1934) ہندو مذہب اس ملک میں ہزاروں سالوں سے چلا آیا ہے۔ اسلام صدیوں تک اس پر حکمران رہا۔ لیکن جو کام مسیحیت نے گذشتہ پچاس سال کے اندر کر دکھایا ہے۔ وہ ان مذاہب سے صدیوں میں نہ ہو سکا۔ اور نہ ان مذاہب کے دل میں اس کام کا بیڑا اٹھانے کا خیال تک آیا۔ مسیحی کلیسیا کی دیکھا دیکھی اسلامی انجمنیں اور ہندو سماجیں قائم ہو گئی ہیں۔ لیکن باوجود اپنی اکثریت اور سرمایہ داری کے کسی کام کو سرانجام نہیں دے سکتیں۔ کیونکہ ان میں مسیحیت کے محرکات مفقود ہیں۔ اسلام تقدیر کا قائل ہے تقدیر اس کے صف ایمان کا چھٹا جزو ہے۔ امنت ب ''االلہ وملائکہ وکتبہ ورسلہ وبالیوم الاخرہ والقدر خیر بشرہ من اللہ تعالیٰ والبعث بعد الموت''۔ لہٰذا یہ کام اس سے کسی طرح بھی سرانجام نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ تقدیر کی نسبت قرآن میں آیا ہے کہ ہمارا حال وہی ہو گا۔ جو اللہ نے ہمارے لئے لکھا ہے''(توبہ 51)۔ ہر آدمی کا پرندہ (تقدیر) اللہ نے اس کی گردن میں لٹکا دیا ہوا ہے۔ (بنی اسرائیل 14)۔ ''ہم نے ہر شے ایک اندازہ سے پیدا کی ہے''(قمر 49)۔ ''اللہ نے اندازہ کے مطابق پیدا کیا۔ اور ان کی تقدیر مقرر کی''(اعلیٰ ۲)۔ جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ تو وہاں کے دولت مندوں کو حکم دیتے ہیں۔ تب وہ اس میں نافرمانی کرتے ہیں۔ تب ان پر وعدہ عذاب ثابت ہو جاتا ہے۔ پھر ہم ان کو اکھاڑ پھینکتے ہیں۔ (بنی اسرائیل 17) خدا نے تم میں سے بعض کو بعض پر جو فضیلت بخشی ہے۔ تم اس کی تمنا نہ کرو۔ (نساء 36، اعلیٰ ع ۱) تم کسی چیز کو نہ چاہو گے۔ جب تک خدا نہ چاہے۔ جس کو اللہ نے گمراہ کیا۔ اس کے لئے کوئی راہ نہیں (شوریٰ 45) ''تو اے (محمد) کہہ دے کہ سب کچھ خدا ہی کی طرف سے ہے''(اگر ان کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ اور اگر ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ (اے محمد) یہ تیری طرف سے ہے۔ تو کہہ سب بھلائی اور برائی اللہ کی طرف سے ہے۔ اس قوم کو کیا ہو گیا ہے۔ کہ یہ اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔ (نسا آیت 80) مشکواۃ باب القدر میں حضرت علی سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا

> ''کوئی بندہ مومن نہیں۔ جب تک وہ چار چیزوں پر ایمان نہ لائے۔ یعنی وہ گواہی دے کہ اللہ کے سوائے کوئی حقیقی معبود نہیں اور میں اس کا برحق رسول ہوں۔ اور وہ ایمان لائے ساتھ مرنے کے اور مرنے کے بعد جی اٹھنے کے اور تقدیر پر ایمان لائے۔ یہ ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کی ہے۔ ابن عمر سے راویت ہے کہ رسول خدا نے فرمایا کہ ہر چیز تقدیر کے ساتھ ہے یہاں تک کہ نادانی اور دانائی بھی۔ یہ مسلم نے روایت کی ہے''۔

(مشکواۃ باب القدر)

چونکہ اسلام تقدیر کے قرآنی مسئلہ کا قائل ہے لہٰذا وہ گمراہوں۔ مقہوروں، مغضوبوں، بیماروں، مظلوموں وغیرہ کو ان کی قسمت پر ہی چھوڑ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گو اسلام ہندوستان میں صدیوں تک حکمران رہا۔ لیکن اس نے ہندوستان کے بد قسمتوں اور بد نصیبوں کے لئے کچھ نہ کیا۔ مسیحیت تقدیر کے مسئلہ کی قائل نہیں۔ لہٰذا وہ مخالف حالات کے سامنے ناامید ہو کر مایوسی کی حالت میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی نہیں رہتی۔ بلکہ ان کے خلاف لگاتار جنگ کر کے ان سفلی طاقتوں پر فتح حاصل کر لیتی ہے۔ جو مذہب تقدیر کے مسئلہ کا قائل ہے۔ وہ سرے سے دین فطرت ہونے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا ۔ وہ جبلّت جنگجوئی کی اقتضا کو انسانی ترقی کے وسائل مہیا کرنے کی جانب راغب ہی نہیں کر سکتا۔ حق تو یہ ہے کہ جس طور پر مسیحیت جنگجوئی کی جبلّت کی اقتضا کو بنی نوع انسان کی رفاہ عام اور بہبودی کی خاطر استعمال کر سکتی ہے۔ وہ کسی اور مذاہب سے نہیں ہو سکتا۔ جناب مسیح کی زندگی پر غور کرو۔ آپ کا ہر معجزہ ترس، رحم اور محبت کے جذبات کے جوش زن ہونے کا نتیجہ تھا۔ کلمتہ اللہ نے یہ معجزات اپنی نبوت اور رسالت یا ابنیت کو ثابت کرنے کے لئے نہیں کئے (متی ۱۲: ۳۸) بلکہ آپ کے معجزات آپ کی محبت کا قدرتی اظہار تھے اگر کوئی بیمار کوڑھی، مفلوج، اندھا، بہرا، گونگا وغیرہ آپ کے پاس سے گذرتا تو آپ کی محبت کا اقتضا یہ تھا کہ آپ اس کو شفا بخشیں۔ پس جب مسیحیت کی ''نجات کا کپتان (عبرانیوں ۲: ۱۰) اور اس کے وفادار رسول ''اچھی لڑائی لڑے''(۲۔ تیمتھیس ۴: ۷) تو مسیحی کلیسیا ان کے نقش قدم پر چل کر اور ''اپنے ایمان کے بانی اور کامل کرنے والے مسیح'' (عبرانیوں ۱۲: ۲) سے توفیق حاصل کر کے جہالت غلاظت بیماری، افلاس، لاچاری وغیرہ کی افواج پر حملہ کر دیتی ہے۔

نتیجہ

ہم نے اس فصل میں مسیحیت کی تعلیم پر اس جبلّت کے مختلف پہلوؤں کی روشنی میں نظر کی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جس پہلو سے بھی لڑاکا پن اور غصہ کی جبلّت۔۔۔۔۔ پر نظر کی جائے۔ مسیحیت دینِ فطرت ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔ اور اسلام کسی پہلو سے بھی دین ِ فطرت ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ مسیحیت جنگجوئی کی جبلّت کی تربیت کرتی ہے اور ضبط کی طاقت کو بڑھاتی ہے۔ تاکہ یہ جبلّت اپنی عریانی صورت میں محرک اولیٰ نہ رہے۔ مسیحیت صرف جائز غصہ کی اجازت دیتی ہے۔ اور وہ بھی جب وہ محبت کا ظہور ہو۔ لیکن اسلام انتقام اور قصاص کی تعلیم دیتا ہے جہاد کی طرف لوگوں کے جذبات کو بھڑکاتا ہے۔ اس کے برعکس مسیحیت جہاد بالنفس کی تلقین کرتی ہے۔ جنگجوئی کے بجائے روحانی رقابت کے جذبہ کو ترقی دیتی ہے۔ بنی نوع انسان کے ہر طبقہ کی فلاح اور بہبودی میں حد درجہ تک کوشاں ہوتی ہے۔ لہٰذا جہاں تک اس جبلّت کا تعلق ہے۔ صرف مسیحیت میں ہی یہ صلاحیت ہے کہ وہ دین فطرت کہلائے۔

فصل ششم

استفسار کی جبلّت

استفسار کی جبلّت کی خصوصیات

انسانی فطرت میں یہ ایک طبعی میلان ہے کہ جس چیز کو انسان نہیں جانتا یا جو شے اس کے لئے اجنبی یا غیر مانوس اور غیر معمولی ہوتی ہے۔ اس کی نسبت وہ تجسس اور استفسار (دریافت کرنا، پوچھ گچھ) کرتا ہے۔ اس جبلّت کا یہ اقتضا ہے کہ کسی غیر معلوم شے کی نسبت علم بہم پہنچایا جائے۔ اس جبلّت کے ساتھ تعجب اور حیرت کا جذبہ مخصوص ہے۔ اور ہر ایسی چیز اس جبلّت کی محرک ہو سکتی ہے۔ جو ان چیزوں سے جن سے انسان مانوس ہے۔ مشابہت اور اختلاف دونوں رکھتی ہو۔ مثلاً اگر راہ چلتے کسی شخص کو ایسی چیز مل جائے۔ جو اس کے لئے اجنبی ہو تو وہ فوراً اس کی نسبت تعجب اور استفسار کرتا ہے۔ اپنی عقل کو دوڑاتا ہے تاکہ اس کو یہ علم ہو جائے کہ وہ شے کیا ہے۔ نئی باتیں اور نئی چیزیں اس جبلّت کی خاص طور پر محرک ہوتی ہیں۔ اسی جبلّت کی وجہ سے بچے ہر غیر مانوس اور غیر معمولی بات کی نسبت اپنے بڑوں سے سوال پوچھ کر ان کا دم ناک میں کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات جب وہ ان سوالوں کا جواب دینے سے عاجز ہو جاتے ہیں۔ تو ان کو جھڑک کر چپ کروا دیتے ہیں۔ عدم استعمال کی وجہ سے یہ جبلّت بڑوں میں کمزور ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر ہم اس کا استعمال جاری رکھیں۔ تو یہ جبلّت عقلی قوت اور ذہنی مساعی (کوشش) کا سرچشمہ ہو جاتی ہے۔ اسی جبلّت کی طفیل ہماری عقل رسا آسمان اور زمین کی باتیں دریافت کرتی ہے۔ نئے نظریہ جات قائم کرتی ہے۔ اسی جبلّت کی وجہ سے سائنس نئی باتوں کو آئے دن دریافت کرتی رہتی ہے۔ جن کو سن کر اور دیکھ کر ہم دنگ رہ جاتے ہیں۔ علم اور ہنر صنعت و حرفت کی ترقی اس جبلّت کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اسی جبلّت کی وجہ سے انسان اپنی زندگی کو معرض خطر میں ڈال کر کبھی کوہ ہمالیہ کی بلند ترین چوٹیوں پر چڑھنے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی قطب شمالی پر ڈیرا ڈالنے کی امنگ رکھتا ہے۔ تمام اعلیٰ ترین بے غرض عقلی کوششیں اسی جبلّت کی اقتضا کا نتیجہ ہیں۔

(۲)

جس طرح اس جبلّت کو سائنس کی ایک اصل اور جڑ تصور کرنا چاہیے۔ اسی طرح مذہب اور دینیات کے معاملہ میں بھی یہ جبلّت اصل اور جڑ کا کام دیتی ہے۔ سائنس دیدنی اشیا کی نسبت یہ تجسس اور استفسار کرتی ہے کہ یہ بیرونی اشیا کس طرح، کہاں، اور کب وجود میں آئیں۔ اور مختلف جوابوں کو ایک نظام میں منسلک کرنا چاہتی ہے۔ مذہب اشیا کی نسبت اس امر کا متجسس ہے کہ یہ اشیا کیوں وجود میں آئیں۔ ان کا مبدا اور انتہا ان کی غرض اور غایت کیا ہے۔ فطرت کا مافوق الفطرت کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ اور اس تعلق کے کیا نتائج ہیں وغیرہ وغیرہ۔ پس انسانی سرشت میں اس جبلّت کو سائنس اور مذہب دونوں کی ایک اصل اور جڑ تصور کرنا چاہیے۔

پس ظاہر ہے کہ جس مذہب میں عقل کو یہ جابرانہ حکم دیا جاتا ہے کہ تم ہمارے معاملات میں دخل نہ دو۔ وہ ہر قسم کی تحقیقات اور اجتہادات سے مطمئن تو رہتا ہے۔ لیکن ایسا مذہب فطرت کے خلاف ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص منطق فلسفہ، ریاضیات، سائنس وغیرہ میں عجیب وغریب ایجادات کرتا ہے۔ لیکن جہاں مذہب کا تعلق آیا۔ اس کی عقل کند اور نکتہ بینی بالکل بیکار پڑ جاتی ہے۔ عقل کی متواتر بیکاری کی وجہ سے وہ مذہب لغو عقاید توہمات اور عجائب پرستی اور ناممکنات کا مجموعہ بن جاتا ہے۔

(3)

یہ ظاہر ہے کہ استفسار کی جبلّت کا رجحان ادنیٰ، کم مایہ اور بے حقیقت امور کی جانب راغب نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ہم کو اس جبلّت کو خواہ مخواہ دبانا اور روکنا بھی نہیں چاہیے ورنہ اس سے نقصان عظیم پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ واجب یہ ہے کہ جب ہمارے بچے ہم سے مختلف قسم کے سوالات پوچھیں۔ تو ہم ان کو حتی الامکان درست اور صحیح جواب دیں۔ ہم کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ ایسی باتوں کی نسبت مستفسر ہوں اور ان کی جبلّت استفسار ایسی باتوں کی طرف راغب ہو جو کم مایہ اور ہیچ نہ ہوں۔ بلکہ ان کے جسم، ذہن اور روح کی ترقی کا باعث ہوں۔ تاکہ جب وہ بڑے ہوں تو وہ ان امور پر غور کریں۔ جو انسان کی بہبودی کا باعث ہیں تاکہ ان کی بے غرض عقلی کوششوں نے نوع انسان ترقی پائے۔ بچوں کو جواب دینے کی بجائے ان کو جھڑک دینا اور ان کو خاموش ہو جانے کا حکم دینا اور یوں استفسار کی جبلّت کو دبانا فطرت کے خلاف ہے۔

جبلّت تجسس اور دین فطرت کے لوازمات

پس دین فطرت کے لئے لازم ہے کہ استفسار کی جبلّت کو میدان عمل میں آنے کی اجازت دے۔ اپنے اختیار کے رعب سے اس خداداد جبلّت کو نہ دبا جائے اور نہ روکے۔ برعکس اس کے تجسس و تفحص (تلاش) استفسار، تعجب اور حیرت کے جذبات کی نشو ونما اور ترقی میں کوشاں رہے۔ اس کا یہ بھی کام ہے کہ جبلّت استفسار کا رجحان ادنیٰ، کم مایہ اور ہیچ اور بے حقیقت اشیا کی طرف سے ہٹا کر اہم اور ضروری امور کی جانب راغب کرے۔ اور چونکہ مذہب کا تعلق عالم روحانیات سے ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ ہم دینِ فطرت کے ذریعہ خدا کی معرفت حاصل کر سکیں۔ پس دینِ فطرت کے اصول ایسے ہونے چاہئیں۔ جن کو عقلِ سلیم نہ صرف قبول کر سکے۔ بلکہ جبلّت ِ تجسس کو کام میں لا کر ان اصول کا اطلاق مختلف ممالک واقوام کے مختلف حالات پر کر سکے۔

(۱)

جبلّت تجسس اور مسیحیت

جناب مسیح کے زمانہ میں دینی معلموں کا طبقہ زیادہ تر فریسیوں اور فقیہوں پر مشتمل تھا۔ یہ طبقہ شریعت اور صحائف انبیاء کے علاوہ کتب فقہ پر اس قدر زور دیتا تھا(متی ۱۵: ۲؛ مرقس ۷: ۳وغیرہ) کہ عوام الناس پر انہوں نے عرصہ حیات کو تنگ کر دیا تھا (لوقا ۱۱: ۴۶)۔ یہودی علما کا یہ طبقہ پرلے درجے کا رجعت (واپسی) پسند واقع ہوا تھا۔ اسلاف کے کے اقوال ان کو ازبریاد (زبانی یاد کر لینا) تھے۔ مروجہ عقائد سے باہر قدم رکھنا ان کے نزدیک گناہ کبیرہ سے کم نہ تھا۔ بات بات پر وہ متقدمین کی سند مانگتے اور پیش کرتے تھے۔ جبلّت استفسار اور تجسس کو زائل (دور ہونے والا، کم ہونے والا) کرنے میں انہوں نے کوئی دقیقہ (معمولی بات، باریکی) باقی نہیں رکھ چھوڑا تھا۔ ان کی مثالیں وہی تھی۔

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　آنچہ استاد ازل گفت ہماں میگویم

لیکن انجیل جلیل کا سرسری مطالعہ بھی غبی سے غبی شخص پر ظاہر کر دیتا ہے کہ کلمتہ اللہ کا طرز کلام اس قسم کا نہ تھا۔ آپ عوام الناس کے سامنے جو اپنی زبان معجز بیان کھولتے تو لوگ بے ساختہ پکار اٹھتے کہ ان کو "فقیہوں کی طرح نہیں بلکہ صاحب اختیار لوگوں کی طرح تعلیم" دیتے تھے (مرقس ۲: ۷) آپ نہ تو کسی مروجہ عقیدے کا اس کے رواج کی بنیاد پر لحاظ کرتے۔ اور نہ اسلاف کی سند کا خیال کرتے۔ آپ کی نکتہ رس نگاہ جبلّت تجسس کو کام میں لا کر سطحی اور ظاہری امور کو نظر انداز کر دیتی اور باطنی اور روحانی اصول کو مضبوطی سے تھام لیتی۔ مثلاً سبت کے احکام، حرام، حلال، خوراک، اور اشیا کے احکام، رسمی پاکیزگی کے احکام عورت بیاہ اور طلاق کے احکام، وغیرہ یہود کے ساتھ تمدنی اور مذہبی تعلقات کے احکام نماز، روزہ، خیرات کے احکام وغیرہ وغیرہ پر نظر کرو۔ تو ظاہر ہو جائے گا کہ کلمتہ اللہ نے دنیائے اخلاق کو ایک تنگ و تاریک چاہ سے نکالا جہاں اخلاقیات کے اصول زمان و مکان کی قیود میں جکڑے ہوئے تھے اور شریعت اور رسوم اور فقہ کے "بھاری بوجھ" تلے دب کر دم دے رہے تھے۔ ابن اللہ نے اپنے مسیحائی دم سے اس نیم مردہ بدن میں روح پھونک دی اور ان کو اس قابل بنا دیا کہ عالمگیر اصول ہو کر تمام دنیا پر تاابد حکمرانی کریں۔

(۲)

کلمتہ اللہ نہ صرف خود جبلّت تجسس واستفسار کو کام میں لاتے تھے۔ بلکہ آپ کی یہ عین خواہش تھی کہ آپ کے حوارئین اور سامعین بھی اس خداداد جبلّت کو کام میں لائیں۔ اور جو لوگ ایسا نہیں کرتے تھے۔ ان کی نسبت آپ نے افسوس ظاہر کر کے فرمایا" وہ دیکھتے ہیں لیکن تاہم نہیں دیکھتے۔ وہ سنتے ہیں تاہم نہیں سنتے۔ اور نہیں سمجھتے۔ انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔ اور کانوں سے اونچا سنتے ہیں۔ تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آنکھوں سے معلوم کر لیں اور کانوں سے سنیں۔ اور دل سے سمجھیں" (متی ۱۳ باب)۔ آپ نے اپنے مخالفین کو مخاطب کر کے فرمایا "کتاب مقدس کو ڈھونڈو" (یوحنا ۵: ۳۹)۔ اور تلاش کرنے والوں کی یوں حوصلہ افزائی کی کہ "ڈھونڈو تو پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائے گا" (لوقا ۱۱: ۹)۔ اور کہا کہ

"اگر کوئی خدا کی مرضی پر چلنا چاہے۔ تو وہ تعلیم کی بابت جان جائے گا" (یوحنا۷: ۱۷) منجی عالمین نے فرمایا کہ "راہ حق اور زندگی میں ہوں" (یوحنا۱۴: ۶) ۔"ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد برحق اور عیسیٰ مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے جانیں۔ جو کلام تو نے مجھے پہنچایا وہ میں نے ان کو پہنچا دیا اور انہوں قبول کر لیا اور سچ جان لیا" (یوحنا۱۷ باب) آپ نے شاگردوں کو فرمایا "اگر تم میرے کلام پر قائم رہو گے تو سچائی سے واقف ہو گے۔ اور سچائی تم کو آزاد کرے گی" (یوحنا۸: ۳۱)۔ پس اس تعلیم کے مطابق جبلّت تجسس واستفسار "تمام سچائی" کی جستجو میں (یوحنا ۱۶: ۱۳) منجی عالمین کی روح کے عین منشا کے مطابق کار پرداز ہے۔ آں خداوند کے وعدہ کے مطابق روحِ حق ہم کو تمام سچائی کی راہ دکھاتا ہے (یوحنا۱۶: ۱۳) کیونکہ "فضل اور سچائی صرف مسیح کی معرفت ہم کو ملی" (یوحنا۱: ۱۷)۔ منجی عالمین کی تعلیم ہماری جبلّت استفسار کو راہ صداقت میں چلا کر ہماری تعلیم وتربیت کرتی ہے۔ (زبور ۲۵: ۵ ؛۸۶: ۱۱)۔ کلمتہ اللہ کی روح نے ہر زمانہ میں ہر ملک و قوم اور ملت کو الٰہی معرفت بخشی اور ان اقوام کے سوالات کا ان کی ضروریات کے مطابق جواب دیا (مرقس ۱۳: ۱۱؛ متی ۱۰: ۱۹ وغیرہ)۔

(3)

کتاب مقدس جبلّت تجسس کے استعمال پر جابجا زور دیتی ہے اور اس کے نیک نتائج سے ہم کو آگاہ کرتی ہے۔ مثلاً ہم خدا کے گھر میں داخل ہوں۔ تو وہ اپنی راہیں ہم کو بتائے گا (یسعیاہ ۲: ۳)۔ "جس طرح سمندر پانی سے بھرا ہے۔ اسی طرح زمین خداوند کے عرفان سے معمور ہو گی" (یسعیاہ ۱۱: ۹)۔ "خداوند فرماتا ہے کہ جو فخر کرتا ہے اس پر فخر کرے کہ وہ سمجھتا ہے اور جانتا ہے کہ میں ہی خداوند ہوں جو دنیا میں شفقت وعدل اور راستبازی کو عمل میں لاتا ہوں" (یرمیاہ۹: ۲۴) ۔"اہل دانش نور فلک کی مانند چمکیں گے اور وہ جن کی کوشش سے بہتیرے صادق ہو گئے ہیں۔ ستاروں کی مانند ابدالآباد تک روشن ہوں گے" (دانی ۱۲: ۱۳)۔ "آؤ ہم دریافت کریں۔۔۔ اور خداوند کے عرفان میں ترقی کریں۔ اس کا ظہور صبح کی مانند یقینی ہے۔ خدا کا عرفان قربانیوں سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ (ہوسیع ۶: ۳)۔ مقدس پولُس کہتا ہے کہ "ہم کاملوں میں حکمت کی باتیں کہتے ہیں لیکن اس جہان کی اور اس جہان کے نیست ہونے والے سرداروں کی حکمت نہیں بلکہ ہم خدا کی وہ پوشیدہ حکمت بیان کرتے ہیں جس کو اس جہان کے سرداروں میں سے کسی نے نہ سمجھا۔ ہم نے وہ روح پایا ہے جو خدا کی طرف سے ہے تا کہ ان باتوں کو جانیں۔ جو خدا نے ہم کو عنایت کی ہیں۔ ہم روحانی باتوں کے ذریعہ روحانی باتوں کا بیان کرتے ہیں۔ مگر نفسانی آدمی خدا کے روح کی باتیں قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ روحانی طور پر پرکھی جاتی ہے (۱۔کرنتھیوں ۲ باب)۔ پس ظاہر ہے کہ مسیحیت ہر ایک شخص کو حکم دیتی ہے۔ وہ آزادانہ استفسار کیا کرے۔ "اے عزیزو ہر ایک روح کا یقین نہ کرو۔ بلکہ روحوں کو آزماؤ اور پرکھو "(یوحنا۴: ۱؛ ایوب ۳۴: ۴ وغیرہ)۔ "سب باتوں کو پرکھو اور آزماؤ جو اچھی ہے۔ اسے پکڑے رہو" (۱۔ تھسلنکیوں ۵: ۲۱؛ افسیوں ۵: ۱۰؛ ۱۔کرنتھیوں ۱۲: ۱۰؛ ۱۴: ۲۹؛ مکاشفہ ۲: ۲ وغیرہ) حکمت سے گھر تعمیر کیا جاتا ہے۔ فہم سے اس کو قیام ہوتا ہے۔ علم سے لطیف و نفیس ہوتا ہے۔ دانا آدمی زور آور ہے اور صاحب علم کا زور بڑھتا رہتا ہے (امثال ۲۴: ۳)۔ "دانائی اور تمیز کی حفاظت کر۔ ان کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دے۔ وہ تیری جان کی حیات اور تیرے گلے کی زینت ہوں گی" (امثال ۳: ۲۱)۔ "تو حکمت کی طرف کان لگا فہم کی طرف دل لگا عقل کو پکار۔ اور اس کو ایسا ڈھونڈ جیسے چاندی کو، اور اس کی ایسی تلاش کر جیسی پوشیدہ خزانوں کی۔ تو تو خدا کی مرضی کو حاصل کرے گا۔ کیونکہ خداوند حکمت بخشتا ہے۔ علم و فہم اس کے منہ سے نکلتے

ہیں"(امثال ۲: ۳) "صاحب فہم کا دل علم کا طالب ہے۔ پر احمقوں کی خوراک حماقت ہے(امثال ۱۵: ۱۴)۔ "ہوشیار کا دل علم حاصل کرتا ہے۔ اور دانا کے کان علم کے طالب ہیں"(امثال ۱۸: ۱۵)۔ "اے خدا مجھے صحیح امتیاز اور دانش سکھلا"(زبور ۱۱۹: ۶۶ وغیرہ)۔ "اے خدا مجھے سمجھنے والا دل عطا کر تا کہ میں برے اور بھلے میں امتیاز کر سکوں" (۱۔ سلاطین ۳: ۹)۔ "خداوند فرماتا ہے کہ تو نے معرفت کو رد کیا۔ اس لئے میں بھی تجھے رد کروں گا۔ میرے لوگ عدم معرفت سے ہلاک ہوئے" (ہوسیع ۴: ۶)۔ "حکمت تیرے دل میں داخل ہو۔ علم تیری جان کو مرغوب ہو۔ تمیز نگہبان ہو۔ فہم تیری حفاظت کرے(امثال ۲: ۱۰)۔ "حکمت حاصل کر۔ فہم حاصل کر"(امثال ۴: ۵)۔ "تحقیق اور تفتیش کر۔ دانش افزوں ہو گی"(دانی ایل ۱۲: ۴)۔ خالق نے جبلّت استفسار ہمارے اندر اس غرض سے نہیں رکھی کہ اس کا گلا گھونٹ کر دبا دیا جائے۔ مقدس پولُس علم اور تجسس واستفسار کو خدا کی بخشش اور نعمت قرار دیتا ہے (۱۔ کرنتھیوں ۱۲: ۶)۔ اور فرماتا ہے "تجربہ سے علم حاصل کرتے رہو"(افسیوں ۵: ۱۰)۔ "نبیوں کے کلام کو پرکھو"(۱۔ کرنتھیوں ۱۴: ۲۹)۔ علم کی شیخی کے خلاف خبر دار کر کے فرماتا ہے کہ "اگر کوئی گمان کرے کہ میں کچھ جانتا ہوں تو جیسا جاننا چاہیے ویسا اب تک نہیں جانتا۔ لیکن جو کوئی خدا سے محبت رکھتا ہے۔ اس کو وہ پہچانتا ہے" (۱۔ کرنتھیوں ۸: ۲)۔ "اے بھائیوں تم سمجھ میں بچے نہ بنو۔ بلکہ سمجھ میں جوان بنو" (۱۔ کرنتھیوں ۱۲: ۲۰)۔ "اس وقت خدا سے ناواقف ہو کر تم ان معبودوں کی غلامی میں تھے۔ جو اپنی ذات سے خدا نہیں مگر تم نے خدا کو پہچانا اور خدا نے تم کو پہچانا" (گلتیوں ۴: ۸) ۔"تم نادان بے سمجھ مت بنو۔ بلکہ خداوند کی مرضی کو سمجھو کہ کیا ہے"(افسیوں ۵: ۱۷) ۔"تم نے نئی انسانیت کو پہن لیا ہے اور جو الٰہی معرفت حاصل کرنے کے لئے اپنے خالق کی صورت پر نئی بنتی جاتی ہے"(کلسیوں ۳: ۱۰)۔ "تم تاریکی میں نہیں ہو کیونکہ تم سب نور کے فرزند اور دن کے فرزند ہو اور خدا نے ہم کو مقرر کیا ہے کہ ہم اپنے آقا و مولا سیدنا عیسیٰ مسیح کے وسیلے سے نجات حاصل کریں" (۱۔ تھسلنکیوں ۵: ۴)۔" ہمارا منجی خدا چاہتا ہے کہ سب آدمی نجات پائیں اور حق کی معرفت حاصل کریں" (۱۔ تیمتھیس ۲: ۴ وغیرہ) پاک نوشتے تم کو مسیح پر ایمان لانے سے نجات حاصل کرنے کی معرفت بخشتے ہیں۔ کیونکہ "ہر ایک صحیفہ جو خدا کے الہام سے ہے تعلیم اور الزام اور اصلاح اور راستبازی میں تربیت کرنے کے لئے فائدہ مند ہے۔ تا کہ مردِ خدا کامل بنے۔ اور ہر ایک نیک کام کے لئے بالکل تیار ہو جائے (۲۔ تیمتھیس ۳: ۱۵ وغیرہ وغیرہ)۔

(4)

تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جبلّت استفسار کلیسیا کی زندگی میں ایک زبردست قوت رہی ہے۔ اس نے کلیسیا کی تاریخ میں تعجب کی صورت میں کام کیا ہے۔ جو مسیحیت کی ترقی میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ اس لحاظ سے تجسس واستفسار کی جبلّت کلیسیا کے نظام کی حفاظت کرنے والی قوتوں میں سے رہی ہے ۔ کلیسیا کی حیرت انگیز کامیابی کا راز اسی میں مضمر رہا ہے۔ اور اس کے شاندار فلسفیانہ اور محققانہ کارنامے علمی رجحانات اور ذہنی مساعی اسی پر موقوف رہے ہیں۔ مسیحی کلیسیا نے ہر زمانہ میں ہر قوم کی ضروریات اور مسائل کو حل کرنے اور عقائد کو وضع کرنے کے لئے اسی جبلّت سے مدد لی ہے۔ یہاں تک کہ ہر ملک کے باشندے کلیسیائے جامع کو اپنا حقیقی روحانی گھر سمجھنے لگے۔ اور سب ممالک نے خدا کے جلال کے علم کو اس نور کی جانب راغب کیا جس کا مظہر جناب مسیح ہے۔ روح حق کی زیر ہدایت کلیسیائے جامع ہر ملک اور قوم کے علم کے زیور سے ہر زمانہ میں آراستہ اور پیراستہ ہوتی

ہو گئی۔ تاریخ کلیسیا میں گذشتہ دو ہزار سال سے اب تک کوئی زمانہ ایسا نہیں آیا جب کلیسیائے جامع علمی ترقی کے کسی خاص زینہ پر ٹھہر گئی ہو اور اس نے بزرگان سلف کے عقلی کارناموں پر نظر کرنا ہی غنیمت خیال کر کے اس بات پر قناعت کی ہو کہ متقدمین کے اکتسابات کو ایسا تصور کر لے کہ وہاں تک کسی کے ذہن کی رسائی محال ہے اور اگر کسی ایک ملک کی کلیسیا کے تاریک ترین زمانہ میں ایسی بات ہوئی بھی ہے تو تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ کلیسیائے جامع کے حقیقی روحانی فرزندوں نے اس کے خلاف زبردست احتجاج بلند کر کے اس تاریک زمانہ کو علم کی روشنی سے منور کر دیا ہے۔

(5)

مسیحی عقائد پر نظر کرو۔ تو ان کو عقل سلیم کے تقاضاؤں کے مطابق پاؤ گے۔ مسیحیت کا اصل الاصول یہ ہے کہ خدا ہمارا باپ ہے (متی ۶: ۹؛ ۵: ۴۵؛ ۶: ۲۶؛ ۶: ۳۲؛ ۲۳: ۹؛ لوقا ۶: ۳۶؛ ۱۲: ۳۲؛ رومیوں ۱: ۷؛ ۱۔ کرنتھیوں ۸: ۶؛ ۲۔ کرنتھیوں ۱: ۳؛ افسیوں ۲: ۱۸؛ ۲: ۶؛ عبرانیوں ۱: ۵؛ یعقوب ۱: ۱۷؛ ۱۔ یوحنا ۱: ۳؛ ۳: ۱ وغیرہ وغیرہ)۔ خدا کی ذات محبت ہے (۱۔ یوحنا ۲: ۸؛ ۴: ۱۶؛ ۱۔ کرنتھیوں ۱۳: ۱۱؛ یوحنا ۳: ۱۶؛ ۱۴: ۲۳؛ ۲۔ تھسلنکیوں ۲: ۱۶ وغیرہ وغیرہ)۔ کل بنی نوع انسان خدا کا کنبہ ہے۔ (یوحنا ۱: ۱۲؛ گلتیوں ۳: ۲۶؛ رومیوں ۸: ۱۴۔۱۶) جن پر لازم ہے کہ ایک دوسرے سے مساوات اور محبت کا سلوک کریں (متی ۵: ۴۴۔۴۸؛ ۲۲: ۳۹؛ ۷: ۱۲؛ لوقا ۱۰: ۲۵۔۳۷؛ یوحنا ۱۳: ۳۴؛ ۱۵: ۱۷؛ ۱۳: ۸؛ افسیوں ۵: ۲؛ ۱۔ پطرس ۱: ۲۲؛ ۱۔ یوحنا ۲: ۱۰؛ ۳: ۱۱۔۲۳؛ ۴: ۷۔۱۲؛ ۴: ۲۰۔۲۱ وغیرہ وغیرہ)۔ چونکہ خدا محبت ہے۔ اور اس کی محبت یہ تقاضا کرتی ہے کہ اس کا گنہگار فرزند اپنے گناہوں کو ترک کر کے اس کی طرف دوبارہ رجوع کرے۔ پس جس طرح ایک باپ اپنے گم گشتہ فرزند کی تلاش میں رہتا ہے۔ اسی طرح خدا کی محبت گنہگاروں کی تلاش کرتی ہے۔ (حزقی ایل ۳۴: ۱۱؛ لوقا ۱۵: باب؛ ۱۔ پطرس ۲: ۲۵؛ لوقا ۱۹: ۱۰؛ متی ۹: ۱۳؛ یوحنا ۱۰: ۲۸ وغیرہ)۔ کیونکہ "باپ کی جو آسمان پر ہے یہ مرضی نہیں کہ ان میں سے ایک بھی ہلاک ہو" (متی ۱۸: ۱۴)۔ سیدنا مسیح کلمتہ اللہ ہے جو باپ کی ذات کو ہم پر ظاہر کرتا ہے۔ پس ابن اللہ کے ذریعے اور اس کے وسیلے ہم کو باپ کی محبت کا علم ہوتا ہے (یوحنا ۱: ۱؛ ۱: ۱۸؛ متی ۱۱: ۲۷؛ یوحنا ۱۷: ۲۶؛ ۱۴: ۹؛ ۱۲: ۴۵؛ کلسیوں ۱: ۱۵؛ عبرانیوں ۱: ۳ وغیرہ)۔ پس ہم اس پر ایمان لا کر ابدی زندگی حاصل کرتے ہیں (یوحنا ۱۷: ۳؛ ۱: ۴؛ ۳: ۱۶؛ ۳: ۲۶؛ ۴: ۱۴؛ ۵: ۲۰؛ ۶: ۳۵؛ ۶: ۴۰؛ ۶: ۴۷۔۴۸؛ ۸: ۱۲؛ ۱۰: ۱۰؛ ۱۱: ۲۵؛ ۱۴: ۶؛ رومیوں ۶: ۲۳؛ ۱۔ یوحنا ۱: ۲؛ ۳: ۱۴؛ ۵: ۱۱۔۱۳ وغیرہ)۔ اس کے فضل سے توفیق حاصل کر کے ہم اپنے گناہوں کی غلامی سے نجات حاصل کرتے ہیں (متی ۱: ۲۱؛ یوحنا ۱۲: ۴۷؛ ۱۔ تیمتھیس ۱: ۱۵؛ ططس ۳: ۵؛ عبرانیوں ۷: ۲۵؛ متی ۱۱: ۲۸؛ یوحنا ۷: ۳۷؛ رومیوں ۵: ۱۲؛ ۶: ۲۳ وغیرہ وغیرہ)۔

مذکورہ بالا عقاید مسیحیت کی اساس ہیں۔ کوئی سلیم العقل شخص ان عقاید کو عقل کے خلاف قرار نہیں دے گا۔ مسیحی کلیسیا مختلف ممالک اور مختلف ازمنہ میں ان بنیادی اصولوں کی ہر ملک اور زمانہ کے علم کی روشنی میں توضیح اور تشریح کرتی آئی ہے۔ جبلّت تجسس واستفسار نے مسیحی کلیسیا کی تاریخ میں ایک نہایت زبردست حصہ لیا ہے۔ مسیحیت کے شان دار نظریہ جات اور فلسفیانہ خیالات اسی جبلّت کا نتیجہ ہیں۔

سطور بالا سے روشن ہو گیا ہو گا کہ مسیحیت جبلّت استفسار کے اقتضاؤں کو بطرز احسن پورا کرتی ہے۔ اس کا رجحان بے حقیقت اور ہیچ امور سے ہٹا کر اس کی قوت اور توانائی کو اعلیٰ مقاصد کی جانب راغب کرتی ہے۔ خدا کی محبت کا علم اور اس کی معرفت بخشتی ہے۔ عالم روحانیت کے اصول کا کماحقہ طور پر علم دیتی ہے۔ اس کے اصول اور عقاید ایسے ہیں۔ کہ جن کو عقل سلیم کو قبول کئے بغیر چارہ نہیں۔ پس جہاں تک اس جبلّت کا تعلق ہے۔ مسیحیت دین فطرت ہے۔

جبلّت تجسس اور قرآن کی تعلیم

چونکہ اسلام میں تمام باتوں اور سوالوں کے فیصلوں کا دارومدار قال اللہ اور قال الرسول پر ہوتا ہے۔ لہٰذا اسلام میں سرے سے یہ صلاحیت ہی موجود نہیں کہ اس میں تجسس واستفسار کی جبلّت نشوونما پا سکے۔ یا اس کا میدان عمل وسیع ہو سکے۔ چنانچہ قرآن میں آیا ہے کہ ”جس بات کا تجھے علم نہیں۔ اس کے درپے مت ہو۔ بیشک کان اور آنکھ اور دل ان سب کی اس سے پرستش ہو گی۔ زمین پر اتراتا ہو نہ چل۔ نہ تو زمین پھاڑ سکتا ہے۔ اور نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتا ہے۔ ان سب باتوں کی برائی تیرے رب کو ناپسند ہے“ (بنی اسرائیل 38 تا 40)۔

پس قرآن جبلّت استفسار کے تقضاؤں کے خلاف ہے۔ یہ باتیں رب کو ناپسند ہیں۔ لیکن بقول ڈاکٹر سر محمد اقبال

> ”آزادانہ تحقیق فلسفہ کی روح رواں ہے۔ اور تحقیق ہر قسم کے اختیار کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ سائنس سے زیادہ مذہب کو اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کے عقائد کی بنیاد عقل پر رکھی جائے“۔

(Relegious Thought in Islam pp.102)

لیکن اسلام میں ”اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول“ ہر طرح کے تجسس اور استفسار اور تعجب اور حیرت کے جذبات کا آخری اور قطعی جواب ہے۔ (سورہ عمران 29 و 126، انفال 48، محمد 35 وغیرہ) ”اس کے بعد کسی مومن مرد کو دم مارنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ جو کوئی سچی راہ کھل جانے کے بعد پھر پیغمبر کے خلاف کرے ہم اس کو دوزخ میں ڈال دیں گے“ (نسا 115 و 7 و 62۔ توبہ 64 انفال 3 وغیرہ)۔ ”مومنو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اور اس سے منہ نہ موڑو۔ حالانکہ تم سنتے ہو۔ اور ان کی مانند مت بنو جو کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور نہیں سنتے“ (انفال 20)۔ ”جو لوگ پیغمبر کا حکم نہیں مانتے اور ان کو ڈرنا چاہیے۔ کہ دنیا میں ان پر مصیبت نہ آن پڑے۔ یا کوئی تکلیف کا عذاب ان پر پہنچے“ (نور آیت 63، حشر آیت 7۔ جن 24۔ انفال 1 و 24۔ اعراف 58 وغیرہ)۔ ”اللہ نے جو کتاب تجھ پر نازل کی ہے۔ اس کی بعض آیات پکی ہیں اور دوسری آیات ایسی ہیں جو مشتبہ معنی کی ہیں۔ جن کے دل میں کجی ہے۔ وہ فتنہ اور تاویل کی تلاش ان مشتبہ معنی کی نسبت استفسار کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ لیکن جو پکے عالم ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ان سب پر ایمان لائے۔ جو ہمارے رب کی طرف سے ہے“ (آل عمران 5)۔ ”ایمان والوں کی بات تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں۔ کہ وہ کسی بات کی نسبت فیصلہ کرے تو کہیں کہ ہم نے سنا اور حکم مانا“ (نور 50)۔ ”جب اللہ اور اس

کا رسول کوئی بات مقرر کر دے تو کسی ایمان دار مرد یا عورت کا کام نہیں کہ (اس میں چون وچرا کرے یا۔ اس کی نسبت سوال کرے کیونکہ (اس معاملہ میں) ان کا کوئی اختیار نہیں رہتا" (احزاب 36)۔ پس قرآنی تعلیم کے مطابق ہر مسئلہ کا قطعی جواب قال اللہ اور قال الرسول ہے۔ اگر کسی سوال کے جواب میں یہ معلوم ہو جائے۔ کہ قرآن وحدیث اس کی نسبت کیا کہتے ہیں تو پھر چون وچرا کی گنجائش نہیں رہتی۔ ہر کہ شک آرد کافر گردد۔ مثلاً اگر کوئی مسلمان جہاد کی نسبت یہ دریافت کرے۔ کہ کفار کا قتال کیوں جائز ہے تو قرآن کے مطابق وہ اپنی جبلّت استفسار کو کام میں لا کر یہ پوچھنے کا مجاز نہیں کہ اللہ اور رسول نے ایسے احکام کیوں صادر کئے۔ یہ کافی ہے کہ اللہ نے یہ حکم دیا ہے۔ چنانچہ قرآنی ارشاد ہے "قتال تم پر فرض کیا گیا۔ اور وہ تم کو برا معلوم ہوتا ہے۔ اور شاید تم کسی چیز کو برا سمجھو۔ اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور شاید تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے حق میں بری ہو خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے" (بقر ۲۱۲)۔

مشکواۃ باب القدر میں ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ

> "ایک دن آنحضرت آئے۔ جبکہ ہم تقدیر کے معاملہ میں بحث کر رہے تھے۔ آپ کا منہ لال ہو گیا کہ گویا کسی نے آپ کے چہرہ پر انار نچوڑ دیا ہے۔ آپ نے کہا کہ کیا تم نے اس معاملہ میں حکم دیئے گئے ہو اور کیا میں تمہاری طرف اسی لئے رسول ہو کر آیا ہوں؟ تم سے پہلے لوگ اسی لئے ہلاک ہوئے۔ کہ وہ اس مسئلہ پر بحث کیا کرتے تھے۔ میں تم کو قسم دے کر کہتا ہوں کہ خبردار اس معاملہ میں تم کبھی بحث نہ کرنا"۔

اس کو ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

پس کسی مومن مسلمان کا کام نہیں ہے کہ وہ کسی دینی مسئلہ کے متعلق سوال پوچھے۔ اس کا سر تسلیم خم کرنا ہے اور بس۔ اور اسلام تو نام ہے سر تسلیم خم کرنے کا۔

مژہ بر ہم مزن تا نشکنی رنگ تماشارا

ممکن ہے کہ ہمارے مسلمان برادران یہ خیال کریں کہ اجتہاد (فقہ اسلامی کی اصطلاح میں قرآن وحدیث اور اجماع پر قیاس کر کے شرعی مسائل کا اخذ کرنا) اور مجتہدوں کا وجود یہ ثابت کرتا ہے کہ اسلام میں جبلّت تجسس واستفسار کارفرما رہی ہے۔ لیکن۔

اول۔ قرآن میں اجتہاد کا کوئی حکم نہیں۔

دوم۔ بفرض محال اگر کسی قرآنی آیت پر جبر کر کے اس سے اجتہاد کی سند لی بھی جائے۔ تو مجتہد قرآن وحدیث کی حدود کے اندر ہی اجتہاد کر سکتا ہے۔ قرآنی احکام کا جائز یا ناجائز ہونے کے متعلق وہ اپنی جبلّت استفسار کو کام میں نہیں لا سکتا۔

سوم۔ علاوہ ازیں اہل اسلام میں سنہ ہجری کے ڈھائی سو سال کے بعد یعنی گذشتہ گیارہ سو سال سے کوئی مجتہد (جدوجہد یا کوشش کرنے والا) پیدا نہیں ہوا۔ کیونکہ اس وقت سے اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہوا ہے۔ چنانچہ علامہ سر محمد اقبال لکھتے ہیں۔

> "اہل سنت والجماعت میں مجتہدوں مطلق کے وجود کے امکان کا اقبال تو کیا جاتا ہے۔ لیکن در حقیقت جب سے مذاہب اربعہ قائم ہو گئے ہیں ایسے اجتہاد کا ہمیشہ انکار ہی کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس قسم کے اجتہاد کے ساتھ ایسی نا ممکن شرائط چسپاں کر دی گئی ہیں۔ جن کا کسی ایک شخص میں اکٹھا ہونا امر محال ہے"۔

(Relegious Thought in Islam p.141)

پس لازم ہے کہ ہر مومن مسلمان مذکورہ بالا چار مذاہب میں سے کسی ایک کو اختیار کر لیتا ہے۔ تو پھر اس کو یہ اختیار نہیں رہتا۔ کہ اس مذہب کے اصول و قواعد سے سر مو (ذرا سا بھی) انحراف کرے۔ یہ رویہ صدیوں سے چلا آیا ہے۔ اور اسی طرح چلتا رہے گا۔

پس بروئے قرآن کوئی مسلمان دین کے معاملات میں آزاد خیال کو جگہ نہیں دے سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں تحقیق کی گنجائش نہیں اس کا نتیجہ یہ ہو گیا ہے کہ با اختیار اشخاص کے احکام کو بے چون وچرا تسلیم کرنا۔ تعصب اور ہٹ دھرمی کو کام میں لانا۔ ہر شے کو دوسروں کی سند پر قبول کر لینا۔ اور یوں جبلّت تجسس واستفسار کو روکنا اور دبانا مسلمانان عالم کا طغرائے امتیاز ہے۔ دقیانوسی تفاسیر اور کتب احادیث اور فقہ کو رٹ لینا غنیمت خیال کیا جاتا ہے۔ متقدمین کی تصانیف سند کے لئے کافی سمجھی جاتی ہیں۔ علمائے سلف کے نقش قدم پر چلنا۔ موجب فخر ہوتا ہے۔ متقدمین، محدثین اور مفسرین کے خیالات ومعتقدات کو ہر بات میں فوقیت حاصل ہے۔ پس اسلام فوق الفطرت اعتقادات کے نظام کی قوت اور ان کی اجتماعی تاثیر اور احکام سے قیام پذیر ہوا اور ان کا متحمل رہا۔ اس نے تحقیق واستفسار کے میدان کو وسعت نہیں دی۔ اور نہ دے سکتا ہے۔

جبلّت تجسس اور اسلامی تہذیب اور کلچر

عموماً اہل اسلام یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ علوم وفنون نے اسلام کے گہوارہ میں پرورش پائی۔ اور اسلام کی طفیل ہی اہل مغرب کو یونانی علم وفلسفہ کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ اگر تاریخ اس دعویٰ کی تصدیق کر دے۔ تو یہ ثابت ہو جائے گا کہ اسلام نے جبلّت تجسس کو دبانے کے بجائے اس کے میدان عمل کو اس قدر وسیع کر دیا ہے۔ کہ دنیا تا قیامت اس بار منت سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

(۲)

اس امر کی تحقیق کے لئے علم ادب کی تاریخ کی ورق گردانی ضروری ہے۔ تاریخ ہم کو بتلاتی ہے کہ تیسری صدی مسیحی سے آرامی یا سریانی یونانی تہذیب کے علم بردار نسطوری مسیحی تھے۔ جب افسس کی کونسل نے 431ء میں ان کو بدعتی قرار دے دیا۔ تو وہ ایڈیسہ میں نقل مکانی کر کے آ گئے وہاں سے

489ء میں شہنشاہ زینو نے ان کو ملک بدر کر دیا۔ اور وہ ایران میں آ بسے جہاں ساسانی فرمانرواؤں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ انہوں نے ایران کو مرکز بنا کر ایشیائی ممالک میں بلکہ مغربی چین تک مسیحیت کی تبلیغ کر دی۔ ان کی جلاوطنی کا ایک نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ایڈیسہ کا دارالعلوم مسوپاٹامیہ میں نسی بس(Nesibus)میں منتقل ہو گیا۔ اور وہاں سے ایران کے جنوب مغرب میں جندے شاپور (Jandeshapur)میں چھٹی صدی کے اوائل میں منتقل ہو گیا۔ جہاں ساسانی خاندان کے بادشاہوں نے چوتھی صدی میں ایک دارالعلوم اور ایک ہسپتال قائم کیا ہوا تھا۔ خسرو ونوشیرواں 531 تا579ء کے عہد سلطنت میں یہ شہر علم و فضل کا مرکز تھا۔ جب رومی قیصر جسٹنین(Justinian)نے 529ء میں شہر ایتھنز کے فلسفیانہ درسگاہوں کو بند کر دیا۔ تو یونان کے فضلا اس جگہ نقل مکانی کر کے آ گئے۔ اور یوں سریانی ایرانی اور ہندی فضلا ایک جگہ جمع ہو گئے۔ ان کے تبادلہ خیالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایسے مخلوط مذہب کی بنیاد پڑ گئی۔ جو مختلف خیالات کا معجون تھا۔ جس کا اثر مابعد میں اسلامی خیالات پر بہت پڑا۔ خسرو نے اپنے طبیب کو طبی کتب کی تلاش میں ہندوستان بھیجا۔ اور ان کتب کا پہلوی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اور دیگر بہت سی سائنس کی کتب کا یونانی زبان سے فارسی اور سریانی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ جنڈے شاپور کے دارالعلوم کا ایک طالب علم عرب کا باشندہ اور رسول عربی کا ہمعصر تھا۔ جس کا ذکر محدثوں نے بھی کیا ہے۔ سریانی زبان بولنے والے میں پہلا مشہور شخص ریش عینا(Reshaina)کا سرجیس تھا۔ جو 532ء میں فوت ہوا۔ یہ عالم نسطوری مسیحی نہیں تھا۔ بلکہ مونوفیزائٹ یعقوبی مسیحی تھا۔ اور مسوپوتامیہ کا طبیب اعلیٰ تھا۔ اور اس نے کتب طب کا یونانی سے سریانی میں ترجمہ شروع کیا۔ جالینوس کی کتب کا ترجمہ بھی اسی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اسلام کی ابتدا سے چند سال پہلے پادری اہرون(Ahron)نے یونانی میں طب کی مشہور کتاب تصنیف کی۔ جس کا سریانی میں اور بعد میں عربی میں بھی ترجمہ ہو گیا۔

(3)

جب مسلمانوں نے شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا پر قبضہ کر لیا۔ تو جنڈے شاپور کا دارالعلوم ان کی سلطنت میں علوم وفنون کا مرکز تھا۔ خلفائے بنو امیہ کے زمانہ میں حکومت میں (661ء749ء)علماء دمشق میں آئے۔ یہ علما یا مسیحی تھے اور یا یہودی تھے۔ جن کے نام عربی تھے۔ خلفائے بنو امیہ نے اسلامی سلطنت کو وسعت دی۔ اور عربی ہر جگہ رائج ہو گئی۔ لیکن جائے تعجب ہے کہ پہلی صدی ہجری میں خلفائے بنو امیہ خالص نژاد عربوں پر اپنا مافی الضمیر ظاہر کرنے سے قاصر تھے۔(lagcay of Islam pv.111)جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قدیم عرب کی خالص زبان صرف زمانہ جاہلیت اور ابتدائی اسلامی زمانہ تک ہی محدود رہی۔

(4)

اسلامی حکومت کا زریں زمانہ خلفائے عباسیہ کا تھا۔ لیکن خلفائے عباسیہ نے خالص عربوں اور کٹر مسلمانوں کی امیدوں کے خلاف جنگوں سے فراغت پا کر اپنی توجہ کو غیر عرب علوم وفنون۔ فلسفہ ، کلچر ،اور تہذیب کی جانب کیا۔ چنانچہ 750ء سے 900ء تک کا زمانہ تراجم کا زمانہ کہلاتا ہے خلیفہ المنصور کے زمانہ حکومت 174-75ء)میں یونانی کتب کا ترجمہ جنڈے شاپور میں ہوتا تھا۔ یہاں جارجیس طبیب اعلیٰ تھا۔ جو بخت یسوع (یعنی یسوع نے نجات

دی ہے) خاندان کا ممتاز فرد تھا۔ اس مسیحی خاندان کے طبیب خلیفہ الہادی (786ء) اور خلیفہ ہارون الرشید (809ء) کے طبیب تھے۔ اس خاندان کے سات افراد نہایت مشہور اور ممتاز طبیب تھے۔ اسی خاندان کی بدولت خلفائے عباسیہ نے یونانی علم طب کی کتب کو اپنی سلطنت میں مروج کیا۔

خلیفہ المنصور راسخ الاعتقاد کٹر مسلمان نہ تھا۔ چنانچہ اس نے امام ابو حنیفہ کو درے (کوڑے) لگوائے۔ قید کیا اور مرواڈالا۔ جلال الدین سیوطی بتاتا ہے کہ

> "سب سے پہلے منصور کے وقت میں سریانی اور دیگر عجمی زبانوں سے کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ مثلاً کلیلہ، دمنہ، اقلیدس وغیرہ۔ سب سے پہلے اسی نے غیر ملکیوں کو اہل عرب پر حاکم کیا۔ یہاں تک کہ عرب کے لوگوں میں سے حمال مقرر ہونے بند ہو گئے"

(تاریخ الخلفا صفحہ 184)

غیر عرب لڑیچر کا رواج دیکھ کر خالص عرب جو حقیقی اسلام کے دلدادہ تھے۔ اس سے سخت نالاں تھے۔ چنانچہ "اصمعی کہتے ہیں کہ

> "منصور کو شام میں کوئی بدوی (خانہ بدوش عرب) ملا۔ منصور نے کہا شکر ہے کہ اللہ نے تم پر سے طاعون کو محض اس وجہ سے دفع کیا کہ تم ہماری زیر حکومت ہو۔ جو اہل بیت سے ہیں۔ اس بدوی نے جواب دیا کہ تیری حکومت اور طاعون دونوں یکساں ہیں"۔

(تاریخ الخلفا صفحہ 181)

خلیفہ ہارون الرشید علم دوست اور عالم پرور شخص تھا۔ خاندان برامکہ کے ممتاز افراد جو ایرانی النسل تھے۔ وہ اس کے وزیر تھے۔ ان کی صلاح پر عمل کر کے ہارون نے سلطنت کے خزانوں کو مفید امور کی خاطر خرچ کیا۔ اس نے جابجا سکول اور کتب خانے کھول دیئے۔ تاکہ لوگ علم کے خزانہ سے بہرور ہو سکیں۔ یونانی اور آرامی زبانوں کی اصطلاحات کو عربی زبان کا جامہ پہنایا گیا۔ خلیفہ کی فیاضی کی وجہ سے یونانی، شامی، ایرانی، اور ہندی علما اس کے دربار میں رہنے لگے۔ اور انہوں نے مسلمانوں کو مختلف علوم وفنون کا درس دینا شروع کیا۔

ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ نوویں (۹) صدی ترجموں کی صدی ہے۔ اس زمانہ میں سرجیس کے سریانی ترجموں کی نظر ثانی کی گئی۔ اور دیگر کتابوں کا بھی ترجمہ کیا گیا۔ اور مترجم بالعموم نسطوری مسیحی تھے۔ جو یونانی، سریانی، عربی اور فارسی زبانوں میں ماہر تھے۔ یوحنا ابن ماسوا (Ibn'masawyh) (سن وفات 857ء) نصف صدی تک ہارون الرشید کے جانشینوں کا شاہی طبیب تھا۔ اس نے عربی زبان میں علم طب کی کتب کو تصنیف کیا۔

خلیفہ ماموں الرشید کا زمانہ حکومت (33-813ء تا 218-198ھ) نئی روشنی کا سنہری زمانہ تھا۔ اس خلیفہ نے بغداد میں ترجموں کا مرکز اور کتب خانہ کھول دیا۔ مترجمین میں سے نسطوری مسیحی طبیب حنین ابن اسحاق (Hunayn) (از 809ء تا 873ء) کا اور اس کے خاندان کا نام خاص طور پر قابل

ذکر ہے۔ اس قابل مسیحی نے جالنیوس کی تقریباً تمام کتب کا ترجمہ ایک سو سریانی اور انتالیس عربی کتب میں کر دیا۔ اس کے بیٹے اسحاق اور بھتیجے جیش اور دیگر تلامذہ نے تیرہ سریانی اور ساٹھ عربی ترجمہ کر ڈالے۔ حنین نے نہ صرف یونانی علم کا طب کا ترجمہ کیا۔ بلکہ ارسطو کی تصنیفات او عہد عتیق کے یونانی ترجمہ سیپٹواجنٹ کا بھی عربی میں ترجمہ کر دیا۔ اس کے قریباً ستر شاگرد تھے۔ جن کی اکثریت مسیحیوں کی تھی۔ اور یہ سب کے سب ترجموں کے کام میں مشغول تھے۔ حنین نے نہ صرف بغداد میں ہی کام کیا۔ بلکہ اس نے ملک شام، عراق اور کنعان کا بھی سفر کیا اور سکندریہ تک پہنچا، تاکہ یونانی زبان کے علوم وفنون پر عبور حاصل کرے۔ نوویں (۹) صدی کے اوائل میں یہ ترجمے زیادہ تعداد عربی زبان میں ہونے لگی۔ ان تراجم کو یعقوبی مسیحیوں نے جاری رکھا۔ اسی زمانہ میں جنڈے شاپور کا مدرسہ بند ہو گیا۔ کیونکہ علماء اور فضلائے روزگار خلفا کے دارالحکومت بغداد اور سامرا (Samarra) کی جانب نقل مکانی کر گئے۔ بغداد میں فلسفہ کا باقاعدہ مطالعہ کیا جاتا تھا۔ اور وہاں یونانی کتب کے تراجم اور مطالعہ کا بازار گرم ہو گیا۔ خود خلیفہ ماموں عالم شخص تھا۔ وہ شاعر تھا اور شاعر نواز تھا۔ وہ خود ایرانی خیالات سے متاثر تھا۔ لہٰذا مذہبی رواداری کا حامی تھا۔ اس کے دربار میں ہر خیال کے عالم موجود تھے۔ اسی کے زمانہ میں امام بخاری، حنبل، اور شافعی تھے۔ ہر قسم کے علم وفن کے استاد، شاعر، فلاسفر، طبیب، اس کے وظیفہ خوار تھے۔ اور کسی شخص کا مذہب اس کی ترقی کے راستہ میں حائل نہ تھا۔ یہودی اور عیسائی جو عبرانی اور یونانی اور عربی زبانوں کے عالم تھے۔ اس کے دربار کی زینت تھے۔ انہوں نے قسطنطنیہ، شام، ایشیائے کوچک، آرمینیا، مصر اور لیوانٹ کی خانقاہوں اور کتب خانوں کو یونانی فلاسفروں مورخوں اور حساب دانوں کی تصنیفات کے نسخہ جات حاصل کرنے کی خاطر چھان مارا اور ماموں کے زمانہ حکومت میں مذہب اور نسل کی تمیز مٹ گئی۔ ان علمی مرکزوں میں مسیحی طلبا بغیر کسی امتیاز کے مسلمان طلباء کے ساتھ مطالعہ کرتے تھے۔ ماموں نے لڑکیوں کے لئے مدرسہ کھولا۔ جس میں قسطنطنیہ اور ایتھنز کی عورتیں تعلیم دیتی تھیں۔ اس کے عہد حکومت میں مزوی مذہب نے خراسان میں زندقہ مذہب کی صورت اختیار کر لی۔ لیکن اس نے زندقہ کے خلاف کسی قسم کی کارروائی کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ خود قرآن کو مخلوق مانتا تھا۔ اس کے قائم کردہ سکولوں اور کالجوں میں یونانی علم ہندسہ کی بنیاد پر مختلف علوم نے ترقی کی۔ کسور اعشاریہ کا استعمال ہوا۔ الجبرا نے جنم لیا۔

خلیفہ متوکل نے 856ء میں بغداد میں ایک کتب خانہ کھولا۔ اور ترجموں کا مدرسہ جاری کیا۔ اس دارالعلوم کا افسر اعلیٰ حنین ہی تھا۔ خلیفہ اور اس کے عمائد سلطنت مسیحی علماء کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر دور ودراز مقامات کو یونانی نسخوں کی تلاش میں بھیجتے تھے۔ تاکہ وہ ان نسخوں کو بغداد لائیں۔ اور ان ترجمہ کریں۔ چنانچہ حنین خود جالنیوس کے ایک نسخہ کی نسبت لکھتا ہے کہ

> ”میں نے اس کو مسوپوتامیہ، سیریا، کنعان، اور مصر میں تلاش کیا۔ یہاں تک کہ میں سکندریہ کو بھی گیا۔ لیکن دمشق میں مجھ کو اس کا صرف آدھا نسخہ ملا“۔

اسی زمانہ میں اسلام میں پہلا اور آخری عرب نژاد فلاسفر گذرا ہے۔ یعنی ابو یوسف یعقوب ابن اسحاق الکندی جو کوفہ میں 850ء کے قریب پیدا ہوا تھا۔ اس ایک شخص کے علاوہ تمام اسلامی تاریخ میں کوئی دوسرا مسلمان فلاسفر پیدا نہیں ہوا۔ جو عرب نژاد ہو۔

(5)

پہلی مسلم یونیورسٹی بغداد کی نظامی یونیورسٹی تھی جس کو عمر خیام کے دوست نظام الملک نے 457ھ یا 1072ء میں قائم کیا۔ یہ شخص ترک الپ ارسلان کا وزیر تھا۔ اس کی تھوڑی مدت بعد ہی نیشاپور، دمشق، یروشلیم، قاہرہ، سکندریہ، اور دوسرے شہروں میں یونیورسٹیاں قائم ہو گئیں لیکن ان میں سے بہترین یونیورسٹی مستنصریہ (Mustansiryah) تھی۔ جو 1234ء میں بغداد میں قائم ہوئی۔

(6)

عموماً یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ممالک مغرب نے ارسطو کی کتابیں دوبارہ عربوں سے سیکھیں۔ لیکن تاریخ ہم کو بتلاتی ہے کہ یہ دعویٰ مبالغہ سے خالی نہیں۔ یہ بات تو سچ ہے کہ پادری گنڈسالوس (Dominic Gundisalvus) نے جو سگوویا (Segovia) کا آرچ ڈیکن تھا۔ بارھویں صدی مسیحی میں ابی سنیا ،فارابی، اور الغزالی کی کتب کے مطالعہ کے بعد مغربی زبان میں ارسطو کی کتب کے تراجم کئے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہم کو ماننا پڑے گا کہ ابوالید ابن رشد (از 92-520ھ یا 1126ء) یونانی زبان سے کورا تھا۔ اور اس نے ارسطو کی تعلیمات اور نظریہ جات کو یونانی زبان کے نہ جاننے کی وجہ سے غلط ملط کر دیا تھا۔ ارسطو کی یہی تعلیم جاری رہی۔ جب تک سینٹ ٹامس نے ارسطو کی صحیح تعلیم اور ارسطو کے مفسرین کی راؤں کو ایک دوسرے سے جدا نہ کیا۔

(7)

ہم نے ذرا طوالت کو کام میں لا کر اس زمانہ کے علم وادب کی تاریخ کا ذکر کیا ہے۔ تاکہ منصف مزاج ناظرین تاریخ کے صفحوں سے خود ہی اندازہ لگالیں۔ کہ آیا مذکورہ بالا تہذیب اور کلچر کا سرچشمہ قرآن وحدیث اور عرب نژاد و مسلمان تھے یا نہیں۔ ہم تاریخ کے مطالعہ سے صرف اسی نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ کہ خلفائے عباسیہ کے زمانہ کے خیالات اور اعتقادات اور روشن کارنامے قرآن وحدیث کے مطالعہ کا نتیجہ نہیں ہیں۔ ان علماء کی کثیر تعداد نہ تو عرب نژاد تھی اور نہ مسلمان تھی۔ اسلامی علم وفضل کے مرکز مکہ یا مدینہ نہیں تھے۔ بلکہ خراسان، خوارزم، ترکستان اور بکتیریا تھے۔ مثلاً خوارزمی خیوہ کا باشندہ تھا۔ الفرغانی (Fargani) ٹرانس اور کینیا کا رہنے والا تھا۔ ابوالوفا اور البتانی (Albattani) ایرانی نژاد تھے فارابی ایک ترک تھا۔ اور ابی سینیا بلخ کا رہنے والا تھا۔ الغزالی اور نصیر الدین طوس کے رہنے والے تھے۔ عمر خیام جس نے عربی میں علم جبر و مقابلہ لکھا۔ ایرانی شاعر تھا۔ ابن رشد، الرزقالی (Alzaruali) اور البطروجی (Albitruji) ہسپانیہ کے عرب تھے۔ صرف تمام اسلامی تاریخ میں ایک فلاسفر الکندی عربی نژاد تھا۔ مذہب کے لحاظ سے حنین بن اسحاق اور اس کا بیٹا اسحاق اور قسطا بن لوقا (Qusta bin Luka) اور دیگر مترجم مسیحی تھے۔ ثابت بن قرا مشہور منجم تھا۔ وہ اور البشاقی دونو ستاروں کی پرستش کرنے والے تھے۔ بعض ماشاللہ کی طرح یہودی تھے۔ بصرہ کا الجاحظ (Aljahiz) صاف اقرار کرتا ہے کہ اسلام یونانی فلاسفر کا مرہون منت ہے۔ اسلامی فلاسفروں نے اپنے نظریوں کے منبع اور سرچشمہ کو چھپانے کی کبھی بے سود کوشش نہیں کی۔ اور اگر وہ اس قسم کی کوشش کرتے تھے تو وہ اس امر کو کٹر مسلمانوں سے نہ چھپا سکتے۔ جو قرآن وحدیث کے شیدائی تھے۔ راسخ الاعتقاد مسلمان ان تمام دماغی اور ذہنی مساعی کو جو رسول اللہ کے زمانہ میں نہ تھیں۔ ملعون ومطعون ہی گردانتے رہے۔ انہوں نے فلسفہ کا نام ہی "عقل وکفر کا مرکب" رکھ چھوڑا تھا۔ عربی

فلسفہ در حقیقت ارسطوی اور نو فلاطونی خیالات کا معجون ہے جس کا مذہب اسلام سے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ اس کے معتقدین یا تو عموماً برائے نام مسلمان ہوتے تھے۔ اور یا وہ لوگ تھے۔ جو عباسیہ خاندان کی حکومت کے بعد اپنے خیالات کی خاطر مارے گئے۔ یا قید و زنداں میں رہے۔

جب خلفائے عباسیہ علم کی روشنی بغداد سے دیگر ممالک کو پہنچا رہے تھے۔ تو عرب کے قبائل خانہ جنگی میں مصروف تھے۔ حج کے متعلق ہمیشہ جھگڑا برپا ہوتا۔ اور امیر مکہ حاجیوں کے مال واسباب کو لوٹنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ بغداد اور قاہرہ نے بہتر زور مارا کہ اسلامی ممالک کے باشندے مزاحمت کے بغیر حج کر سکیں۔ لیکن وہ ناکام رہے۔ عرب قبائل ایک دوسرے سے بعینہ اسی طرح برسر پیکار تھے۔ جس طرح رسول عربی کی بعثت سے پہلے تھے۔ عرب جمود کی حالت میں رہے۔ اور غیر ممالک سے کچھ سروکار نہیں رکھتے تھے۔ وہ علم و فن کی تحریک کو شک کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ کٹر مسلمانوں کی نگاہ میں خلفائے عباسیہ کے زمانہ کی نئی روشنی کی تحریک زبردست بدعت تھی۔ جو قرآن وحدیث اور سنت نبوی کے خلاف تھی۔ پس سلجوق نے قرآن وحدیث کی حمایت میں خاندان عباسیہ کا خاتمہ کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس سنہری زمانہ کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اور اسلامی سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔ چنانچہ مشہور اسلامی مورخ ایس خدا بخش مرحوم کہتا ہے کہ

> ”عباسیہ خاندان کے بعد مسلم سلطنت کے زوال کا سبب اس کا مذہب اور سیاسیات تھے۔ چونکہ اسلام میں یہ دونوں ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مذہب جو ابتدا میں مسلمانوں کی کامیابی کا سبب تھا۔ اب ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہو گیا۔ اگرچہ ظاہری طور پر سلطنت ”اسلامی“ تھی۔ لیکن اندرونی طور پر مذہب بے معنی رسوم کا مجموعہ ہو گیا تھا اور تعصب۔ مذہبی جنون، ترقی سے نفرت، بے بصیرتی، نئی روشنی اور نئی تعلیم کی مخالفت کا بول بالا تھا۔ روشنی کے عہد کا خاتمہ ہو گیا۔ اور تاریکی کی حکومت کی ابتدا ہو گئی۔ وہ زمانہ چلا گیا۔ جب مسلم فلاسفر نظام کہا کرتا تھا کہ ”علم کی پہلی شرط شک کرنا ہے“۔ اب اسلام کے نزدیک شک کرنا بے عزتی ،عقوبت، اور موت کا مترادف تھا۔ مذہب کا روشنی علم اور ترقی کے ساتھ واسطہ نہ رہا۔ ہر واقعہ اللہ کی مرضی کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ جس کے خلاف کسی قسم کی جدوجہد کرنا کفر اور پرلے درجہ کی حماقت خیال کی جاتی تھی۔ اسلامی سلطنت کا زوال نہ صرف شروع ہو گیا۔ بلکہ زوال نے جڑ پکڑ لی۔ مسلمان مردہ اور لاپرواہ ہو گئے۔ اور دیگر ممالک کی علمی تحریکوں کی جانب سے غافل ہو کر یا بد اخلاقی کے گڑھے میں گر گئے۔ یا مذہبی جنون میں گرفتار ہو گئے۔ اور ان کی دماغی اور ذہنی حالت تاریک ہو گئی“۔

32(Essays Islamic Indian p.)

پس خلفائے عباسیہ کے زمانہ کی تہذیب کو ہم قران وحدیث یا ”عرب“ کی تہذیب نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ یہ تہذیب ممالک مفتوحہ کے باشندوں کی تہذیب تھی۔ جو جبراً اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے۔ ان خلفاء کے زمانہ میں اسلامی سلطنت نے یونانی، ایرانی، شامی، قبطی، کلدانی اور ہندی تہذیب سے فائدہ اٹھایا تھا۔ ان مفتوحہ ممالک کی تہذیب کا قرآن وحدیث سے کچھ واسطہ نہیں۔ کیونکہ اسلام کی آمد سے پہلے یہ ان ممالک میں موجود تھی۔ اگر

کلچر اور تہذیب سے مراد یہ ہے کہ کسی قوم کے افراد کا ذہن رسا اس قوم کو ترقی کی شاہراہ پر چلا رہا ہے۔ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یونانی تہذیب کا وجود تھا۔ رومی تہذیب کا وجود تھا۔ اسلامی تہذیب کا وجود تھا۔ لیکن یہ تہذیب عرب کی تہذیب نہیں۔ کیونکہ وہ مفتوحہ ممالک کے باشندوں کی تہذیب تھی جو عربی نسل اور ملک کے نہ تھے۔ یہ اسلامی تہذیب قرآن وحدیث اور خالص عربی اسلام کی وجہ سے معرض وجود میں نہیں آئی تھی۔ چنانچہ علامہ اقبال کہتے ہیں کہ

> "ہم سب جانتے ہیں کہ یونانی فلسفہ نے اسلام کے تہذیب پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ لیکن اگر ہم قرآن کا اور اسلام کے ان مذاہب کا بغور مطالعہ کریں۔ جو یونانی فلسفہ کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ تو یہ روشن حقیقت ہم پر واضح ہو جاتی ہے۔ کہ اگرچہ یونانی فلسفہ نے اسلامی علما کے اذہان کو کشادہ کر دیا تھا۔ لیکن اس نے قرآن کو دھندلا کر دیا۔ یہ لوگ قرآن کو یونانی فلسفہ کی روشنی میں پڑھتے تھے۔ اور دو صد سال کے بعد ان کو یہ معلوم ہوا۔ کہ قرآن کی روح یونانی فلسفہ کے نقیض ہے غزالی نے دنیات کی بنیاد شک کے فلسفہ پر رکھی۔ اور یہ بات بھی قرآن کے خلاف ہے"

(Religious Thought in Islam pp.3-4)

پس ثابت ہو گیا کہ اسلامی سلطنت کے علم و فضل کے زمانہ کے ذمہ دار قرآن وحدیث نہ تھے۔ غیر ممالک کے خیالات قرآن وحدیث سے متاثر نہیں ہو رہے تھے۔ بلکہ اس کے برعکس ان ممالک کے خیالات یعنی یونانی مسیحی، یہودی، ایرانی، ہندی خیالات سے اسلام متاثر ہو رہا تھا۔ ان غیر عرب ممالک میں کتب خانے کھل گئے۔ جن میں غیر عرب کاتبوں کی فوج کی فوج نسخوں کی نقل میں مصروف تھی۔ بغداد علم کی روشنی کا مرکز تھا۔ جس کی شعاعیں ہسپانیہ تک پہنچیں۔ اور یہ باتیں اس واسطے ممکن ہو گئی تھیں۔ کیونکہ خلفائے عباسیہ نے قرآن وحدیث کی تعلیم کو ترک کر کے مذہبی رواداری کی پالیسی اختیار کر لی تھی۔ پس اس تحریک کا سہرا اسلام پر نہیں بلکہ یہ نئے خیالات یونانی، یہودی، ترکی، مسیحی، قبطی، کلدانی، آرامی، شامی، ایرانی، اور ہندی خیالات اور سنسکرت کی کتب کے ممنون احسان تھے۔(See Spengler's Deeline of the West)۔

یہی وجہ ہے کہ سر ٹامس آرنلڈ جیسا متشرق کہتا ہے کہ

> "اسلام نے جو ترکہ چھوڑا ہے۔ وہ رسول عربی کے دین اسلام کے اصولوں کی وجہ سے نہیں ہے۔ اسلام کے ترکہ میں کوئی ایسی بات نہیں پائی جاتی۔ جس کا تعلق خاص اسلام کے ساتھ ہو۔ اس کے برعکس جب کبھی حضرت محمد کے خالص مذہب نے اپنا اقتدار جمایا۔ وہاں اسلام کے ترکہ اور وراثت کی قیمت صفر برابر ہو گئی"۔

(Legacy of Islam edly Sir .T.Avroldalfred and Guillaume oxford1931p.v)

جبلّت تجسس اور اسلامی ممالک کی تاریخ

اس فصل کے شروع میں ہم ذکر کر چکے ہیں۔ کہ علم نفسیات کے مطابق جب کسی بچے کی جبلّت تجسس اپنے اختیارات اور رعب سے دبایا جاتا ہے۔ تو بڑا ہونے پر یہ جبلّت اس میں نہایت کمزور ہو جاتی ہے اسی طرح اسلامی ممالک میں جبلّت تجسس عدم استعمال کی وجہ سے نہایت کمزور بلکہ مردہ پڑ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ممالک میں علمی رجحانات اور ذہنی مساعی تقریباً مفقود ہیں۔ تجسس واستفسار کی جبلّت بنی نوع انسان کے تمام شان دار اکتسابات کی تہ میں ہے۔ ان رجحانات کا آزاد اور موثر عمل جماعتوں قوموں، ملتوں اور ملکوں کی تہذیب کا نہ صرف معیار ہے۔ بلکہ ان کی تہذیب کی ترقی کی خاص شرط بھی ہے۔ کیونکہ اگر ہم ان ممالک واز منہ پر محققانہ نظر کریں۔ جن میں عقلی اکتسابات ہوئے ہیں۔ تو ہم دیکھیں گے کہ وہ زمانے بعینہ ان زمانوں پر منطبق (برابر) ہیں۔ جن میں اجتماعی ترقی ہوئی ہے۔

(۲)

ملک عرب گذشتہ چودہ (۱۴) صدیوں سے اسلام کا حلقہ بگوش رہا ہے۔ لیکن عرب میں لطیف تخیلات کا نام نہیں ہے۔ وہ فلسفہ سے نا آشنا ہے۔ خالص عربی علم ادب میں کوئی جدت نہیں پائی جاتی۔ ملک کی آب وہوا ہی ایسی ہے کہ دن کی دھوپ کی گرمی، آفتاب کی تپش، صحرا کی جلتی ریت کی جدت وغیرہ ذہنی مساعی کے حق میں باد سموم کا اثر رکھتی ہیں۔ خود مذہب اسلام میں جیسا صاحب رسالہ ینابیع الاسلام نے ثابت کر دیا ہے کوئی نیا عنصر نہیں جو مذاہب سابقہ میں نہ تھا۔ اس پر ''قال اللہ اور قال الرسول اور اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول'' کے احکام نے علمی رجحانات کا باب مسدود کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی کی دوڑ میں تمام مہذب ممالک عرب سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ عرب ترقی یافتہ ملک شمار نہیں ہو سکتا۔ اس کی اخلاقی حالت اعلیٰ نہیں۔ تعداد ازدواج اور طلاق کا ہر جگہ دور دورہ ہے۔ اس نے ''زمانہ جاہلیت'' سے آج تک علم وادب اور علوم وفنون میں ترقی نہیں کی بدوی ان پڑھ اور جاہل ہیں۔ شہروں میں کتب کا علم قرآن حدیث اور فقہ کے مطالعہ تک محدود ہے۔ تقدیر اور قسمت کے جان ستان عقیدہ نے ترقی کی راہ کو مسدود کر رکھا ہے۔ ظلم، بے انصافی، قتل اور لوٹ مار کا بازار گرم ہے۔ 1925ء میں سلطان ابن مسعود کو طاقت حاصل ہوئی۔ اس کے زمانہ میں قرآن وحدیث کا دور دورہ رہے۔ سیاسیات کی بنیاد دینیات پر ہے۔ شریعت عرب کے ذہنوں اور مذہبی خیالات پر حکمران ہے۔ اگر کوئی شخص قرآن وحدیث کے خلاف اپنی عقل اور آزادانہ رائے رکھتا ہے۔ تو اس کو قرار واقعی سزا دی جاتی ہے۔ تاکہ دوسرے عبرت پکڑیں ملک عرب میں استفسار، تفحص، اور تجسس کا جواب ''قال اللہ اور قال الرسول اور اطیعوا اللہ اطیعوا الرسول'' ہی ہے۔ بیسویں (۲۰) صدی میں عرب کو ایک تنگ، محدود اور لا تبدیل شریعت پر اور ایک ایسی آسمان کتاب پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ جس کا تعلق ساتویں (۷) صدی کے ساتھ تھا۔ کیا آج کے دن ہندوستان یا مصر یا ترکی کے مسلمان عرب کے ملک میں وہابی حکومت کے زیر سایہ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ آج ہندوستان میں کتنے مسلمان ہیں۔ خواہ وہ لکھے پڑھے ہوں خواہ ناخواندہ جاہل ہوں۔ جو وہابی خیالات کی حمایت اور قدر کرتے ہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہابی خیالات خالص قرآن وحدیث پر مبنی ہیں ''فاعتبروا یا اولی الابصار''۔

خیالات کی آزادی عرب کے صحرا اور بادیہ میں پھل پھول نہیں سکتی۔ یہ حالت اس ملک کی ہے جو خدا کا برگزیدہ ہے (سورہ حج آیت 77)۔ جس کا ہر ایک شعبہ چودہ (۱۴) صدیوں سے مذہب اسلام کے ماتحت رہا ہے۔ جب تک عرب اسلام کے زیر نگین رہے گا۔ وہ ترقی نہیں کر سکتا۔

(3)

ایک عرب پر ہی کیا موقوف ہے۔ تاریخ اسلام کی ورق گردانی کرو تو تم دیکھو گے۔ کہ جس ملک میں بھی اسلام گیا۔ اس نے استفسار کی جبلّت کو یہاں تک دبایا کہ ان ممالک واقوام میں جستجو کا مادہ زائل ہو گیا۔ ان کے علوم وفنون یکسر حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔ اسلام نے مصر کو 641ء میں فتح کیا۔ اور مصر کی قدیم تہذیب علوم وفنون۔ صنعت وحرفت کو ایسا دھچکا لگا کہ وہ ٹھنڈے پڑ گئے۔ ان کا خاتمہ ہو گیا۔ آخر کوئی وجہ تو ہے کہ جب شامی، مصری، اور بر ابری اقوام یونان اور روما کے ماتحت تھیں۔ تو وہ اپنی فہم وفراست اور ذہن رسا اور علم دفن کے لئے مشہور تھیں۔ لیکن جونہی وہ اسلام کی حلقہ بگوش ہو گئیں۔ وہ ترقی کی منازل میں بہت پیچھے رہ گئیں۔ اور جہالت اور عصبیت ان کا طغرائے امتیاز ہو گیا۔ ملک ہسپانیہ میں اسلامی تاریخ اسی صداقت کی گواہ ہے۔ جب اس ملک پر خلفائے قرآن وحدیث کے مطابق حکمرانی کی، تو ترقی کا دروازہ بند ہو گیا۔ اور تہذیب کا دور ختم ہو گیا۔ لیکن اس کے برعکس جب کوئی خلیفہ مذہبی جنون سے خالی ہوتا تو اس قوم کو ترقی اور آزاد خیالی نصیب ہوتی۔ پس ظاہر ہے کہ جب خالص اسلام کو غلبہ حاصل ہوتا ہے تو اس ذہنیت کو غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ جو قوت متخیلہ سے خالی اور جدت وافتراع کے خلاف ہے۔ جونہی ہسپانیہ سے اسلام کا غلبہ ختم ہو گیا۔ اور وہ مسیحیت کا حلقہ بگوش ہو گیا۔ تو ملک نے اسلامی خیالات کے پنجہ سے رہائی حاصل کی اور اس کی ترقی اور تہذیب نصیب ہوئی۔

قرآن وحدیث کے احکام ان ممالک کے حالات پر ہر گز عاید نہیں ہو سکتے۔ جنہوں نے یونانی اور رومی تہذیب کے گہوارہ میں پرورش پائی ہے یا جو اقوام دور حاضرہ میں مغرب کے خیالات اور جذبات سے متاثر ہو چکی ہیں۔ چونکہ اسلام زندگی کے ہر شعبہ کی ادنیٰ ترین تفصیل پر بھی واحد حکمران ہونے کا مدعی ہے۔ لہٰذا وہ ان ممالک کی فضا میں پھل پھول نہیں سکتا۔ جن کے افراد آزادی خیالات کے عادی اور حامی ہو چکے ہوں اور جو ہر بات میں ہر طرح کی سند اور اختیار کو چیلنج کرتے رہے ہیں۔ ہاں ایشیا اور افریقہ کے وہ ممالک جو تاحال ترقی یافتہ نہیں۔ جہاں آزاد خیالی کا دور دورہ نہیں۔ اور جو اقوام بزرگان سلف کے خیالات پر چلنا ہی موجب سعادت دارین سمجھتی ہیں۔ ایسے ممالک میں اسلام مروج ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی زیادہ تر آبادی افغانستان۔ صوبہ سرحد بلوچستان، کشمیر، ڈچ ایسٹ انڈیا وغیرہ میں ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال کہتے ہیں۔ کہ

> ”تاریخ اسلام میں ایسی بدعت کے ارتکاب کی مثال بہت ہی کم ملیگی۔ جس نے معینہ حدود کے اندر رہ کر کسی دوسری توجیہ کی جرات کی ہو“۔

(اسلام اور احمدیت صفحہ ۱۲)

ایڈیٹر زمیندار (9 ستمبر 1936ء) کہتا ہے

"اللہ تعالیٰ نے دین کو کامل کر دیا۔۔۔۔ علمائے حق نے کبھی نئے شاخسانے کھڑے کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے حق وصداقت قرآن وسنت اور توحید وحسن عمل کی طرف بلایا۔ ان کی پکار وہی ایک پکار تھی۔ کوئی نئی پکار نہیں تھی۔ جس کے حسن وقبح اور صدق وکذب معلوم کرنے کے لئے امت کا ذہن مبتلائے فتنہ ہو جاسکے"۔

پس کیا مغرب اور کیا مشرق۔ جہاں کہیں اسلام گیا۔ اس کی آمد واور غلبہ نے تجسس تفحص اور استفسار کا خاتمہ کر دیا۔ یہ حقیقت ایسی عیاں ہے کہ آزاد خیال اور منصف مزاج مسلمان بھی اس کو تسلیم کرنے کے بغیر چارہ نہیں دیکھتے۔ چنانچہ ایران کے شہر تبریز کی اخبار آزاد نے اپنی اشاعت مورخہ یکم جنوری ۱۹۲۲ء میں لکھا

"تمام دنیا کے مسلمان ہر امر میں ادنیٰ، مفلس، غلیظ، غیر مہذب، بیوقوف اور جاہل ہیں۔ اور یورپ اور امریکہ کے عیسائیوں سے بلکہ زرتشتیوں سے بھی دو صد سال پیچھے ہیں۔ اگر اسلام کا یہ حال بعض ممالک میں ہی ہوتا۔ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ بری حالت دیگر اسباب کا نتیجہ ہے۔ لیکن دنیا کے ہر ملک میں اسلام کی حالت یہی ہے پس ہم سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کہ یہ حالت اسلام ہی کا نتیجہ ہے"۔

(Quoted in John's Finality of Chirst .p.21)

(4)

پس اہل اسلام اس بات سے واقف ہوگئے ہیں کہ قرآن وحدیث نے استفسار کی جبلّت کو خلاف فطرت طور پر دبا دیا ہے۔ تاریخ اسلام سے ظاہر ہے کہ مفتوحہ ممالک نے اس حالت کے خلاف کئی دفعہ علم بغاوت بلند کیا ہے۔ اور یہ بغاوت تین اطراف سے ہوئی ہے۔

اول۔ امام غزالی اور دیگر صوفیائے یہ کوشش کی ہے۔ کہ قرآن وحدیث کی تعلیم کو روحانی لباس پہنایا جائے۔ لیکن یہ مساعی بے سود ثابت ہوئیں۔

دوم۔ جب اسلام پر فلسفہ کا بیرونی اثر پڑا۔ تو جبلّت استفسار جنبش میں آئی۔ اور لوگوں نے دینی امور کی نسبت سوال پوچھنے شروع کئے۔ مذہبی امور کی اساس کی نسبت بحث وتمحیص شروع ہوگئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اسلام میں دو فرقے ہوگئے۔ ایک وہ جو بغیر چون وچرا قرآن کو کلام اللہ مانتے تھے۔ لیکن دوسرا فرقہ قرآن کے مطالعہ میں عقل کو راہ دیتا تھا۔ یوں فرقہ منزلہ کی ابتدا آٹھویں (۸) صدی مسیحی میں ہوئی لیکن معتزلہ بدعتی تصور کئے جاتے تھے۔ گو ان میں صرف معدودے چند ہی ایسے تھے۔ جو یونانی اور فلسفیانہ خیالات کے ماتحت علم کو علم کی خاطر تلاش کرتے تھے۔ زیادہ تعداد ایسوں کی تھی جو اپنا وقت عزیز صرف اسلام کے مطالعہ میں صرف کیا کرتے تھے۔

خلفائے عباسیہ کے دوران عہد میں اخوان الصفا نے بصرہ میں یہ کوشش کی کہ دینی معاملات میں اصول عقلیہ سے کام لیا جائے اور اسلام میں فلسفیانہ خیالات کا دور دورہ ہو۔ لیکن قرآن وحدیث کے ماننے والے ان کو کافر اور ملحد تصور کرتے رہے۔ مثلاً ابو سلیمان المنطقی ان کی بابت کہتا ہے

"شریعت کو اللہ تعالیٰ نے ایک ملہم نبی کے ذریعہ بھیجا۔ اور ہم پر فرض ہے کہ ہم بے چون وچرا اس کی اطاعت کریں۔ منجموں کے خیالات اور علم طبیعات کی باتیں۔ مثلاً گرمی، سردی، سیال، خشک۔ مختلف اجزا کی اجتماعی حالت وغیرہ کا یا منطق وہندسہ کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر یہ امور جائز ہوتے۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو جائز قرار دے کر شریعت کو مکمل کر دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے برعکس اس نے ان امور کو منع فرمایا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا۔ کہ انسان ضعیف البنیان (کمزور، انسان) اس کے رازوں کی خواہ مخواہ تلاش میں سرگرداں ہو زمانہ ماضی میں مسلمانوں نے فلسفہ کی امداد کے بغیر اپنی مذہبی مشکلات کو حل کر لیا ہے"۔

امام غزالی جیسا عالم بھی صرف ایسے علم کو ضروری خیال کرتا ہے۔ جو مومن مسلمان کو اس کے دینی فرائض کی ادائیگی میں مدد دے سکے۔ وہ پہلا کے طبقہ کو یہ اجازت نہیں دیتا۔ کہ وہ کسی شے کی نسبت استفسار کریں۔ کتاب الفضل میں ابن حزم کہتا ہے

> "ہر ایک امر جو عقل سے ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ یا تو قرآن میں موجود ہے یا حدیث میں لکھا ہے لیکن چونکہ قرآن نے تمام مذاہب کو منسوخ کر دیا۔ لہٰذا قرآن نے ان تمام علوم وفنون کو بھی باطل کر دیا ہے۔ جن کا تعلق ان مذاہب سے تھا"۔

دور حاضرہ میں مصلحین نے یہ کوشش کی ہے کہ اسلام کے دقیانوسی لباس میں نئی روشنی کے خیالات کے کورے کپڑے کا پیوند لگا دیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اسلام میں نت نئے فرقے اور نئے مذہب جاری ہو گئے ہیں۔ مثلاً بابی مذہب، بہائی مذہب، سرسید احمد خان کا نیچری مذہب، قادیانی مذہب وغیرہ۔ اسلام کے مختلف فرقے اور مذاہب ایک دوسرے کے اصولوں پر قرآن وحدیث کی بنا پر نکتہ چینی کر کے ایک منصف مزاج غیر مسلم پر یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ خواہ اسلام میں کتنی ہی اصلاح کی جائے۔ اس میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ قرآن وحدیث کی خالص تعلیم پر عمل پیرا ہو کر کسی قوم اور ملک کو شاہراہ ترقی پر چلا سکے۔ دور حاضرہ کے اسلامی ممالک کو اس بات کا پختہ یقین ہو گیا ہے۔ کہ جب تک وہ اسلام کے زیر نگین رہیں گے۔ اور قرآنی احکام اور اسلامی شرع کی قیود میں جکڑے رہیں گے۔ وہ کسی قسم کی ترقی نہیں کر سکیں گے۔ لہٰذا ان ممالک نے اسلام کا بھاری بوجھ جو اتار پھینکنے کی کوشش کی ہے۔ ان مساعی کا ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر کریں گے۔

(5)

جب سے عرب نے ترکی پر غلبہ حاصل کیا تھا اور قرآن اور حدیث ان پر حکمران رہے۔ تو اسلام نے ان تمام ترقی کے خیالات کو جن کا تعلق قرآن اور فقہ سے نہ تھا۔ کفر سے منسوب کر کے ترکوں کو قرآن وحدیث کی حدود کے باہر نکلنے نہ دیا۔ جب مصطفیٰ کمال اور اس کے ہم خیالوں نے یہ احساس کیا کہ ترکی کا زوال اس کے مذہب اور دینیات کی وجہ سے ہے۔ تو انہوں نے اسلامی شریعت اور اپنے ملک کی ترقی کے باہمی رشتہ کو بیک جنبش قلم توڑ دیا۔ ایک فاضل ترک ایبل آدم اپنی کتاب موسومہ کتاب "مصطفیٰ کمال" (قسطنطنیہ 1926ء) میں لکھتا ہے

"ہمارے مدرسوں میں ایک ہی منطق اور ایک ہی ذہنیت ہے کہ دینی کتب سے سب امور کا استخراج کیا جائے۔ اسلامی مدرسے سلطنت ترکی کو بچا نہ سکے۔ کیونکہ ان کی یہ تعلیم تھی کہ حقیقت اور سچائی صرف قرآن حدیث اور سنت نبوی میں ہی پائی جاتی ہے۔ اسلامی متکلمین نے ضمیر اور خیالات کی آزادی لوگوں کو نہ دی۔ اور اسلامی شرع نے زندگی سے اس کا حق چھین لیا۔ ایشیائی اقوام قوانین اسلام کے ماتحت رہی ہیں۔ اور ان کے آئین کتب دینیات سے ہی اخذ کئے گئے ہیں۔ اور چونکہ یہ آئین لا تبدیل ہیں۔ لہٰذا وہ ترقی کی راہ کو بند کرتے رہے ہیں۔ کبھی کسی کو یہ خیال نہ آیا۔ کہ زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ آئین و قوانین کا بدلنا بھی لازم ہے۔ اس کے برعکس وہ سیاہ غلاف والی کتاب (قرآن) سے آئین اخذ کرتے رہے۔ جو قسطنطنیہ سے پہلے بغداد میں تھی۔ اور بغداد سے پہلے مکہ میں تھی۔ اور صحرا کے ابتدائی باشندوں کی کتاب تھی کیا ہم ایسے آئین و قوانین پر عمل کر سکتے ہیں۔ جو نفسیات اور معاشرتی زندگی کے نشو و نما اور ترقی کا خیال تک نہ کریں۔ ترکی نے اپنی تمام آمدنی مدرسوں پر خرچ کر دی۔ لیکن ان کی تعلیم کا ترکی قوم، ترکی زبان اور ترکی تہذیب کے ساتھ کچھ تعلق نہ تھا۔ ترکی کی تاریخ میں سب سے زیادہ شرمناک بات یہ ہے کہ درسگاہوں نے الٰہیات کی بنیاد قرآن و حدیث پر رکھی ہے۔ اور جو شخص اس محدود دائرہ سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ اس کو مطعون و ملعون قرار دیدیا۔ مسیحیت بھی اسلام کی طرح ایک ایشیائی مذہب تھا۔ لیکن اس نے کسی قوم کی معاشرت اور تمدنی زندگی پر جبر روا نہ رکھا۔ مسیحیت شہر روما میں گئی۔ لیکن وہ اپنے ساتھ یہود کی معاشرتی زندگی نہ لے گئی۔ اگر اسلام کی طرح مسیحیت بھی ایک لشکر جرار کے ساتھ یروشلیم سے چلتی۔ اور یورپ پر قابض ہو جاتی تو یورپ کا بھی اسلامی ممالک کا سا حال ہو جاتا۔ لیکن مسیحیت نے ایسا نہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ سلامت اور محفوظ ہے۔ ترکی نے یہ کوشش کی کہ دور حاضرہ کے مطابق چلے۔ اور مسلمان بھی رہے۔ لیکن یہ نہ ہو سکا۔ ان قوانین کے جو اسلام سے اخذ کئے گئے تھے۔ برے نتائج ظاہر ہیں"۔

(صفحہ 7 تا ۱۲)(Muslim's World July 19۲(7

پھر یہی ترک کہتا ہے کہ

"اسلام کے آہنی قفس (لوہے کے قید خانے) نے ایشیائی اقوام کی نجات کا کوئی امکان رہنے ہی نہ دیا تھا"۔

اسی طرح جلال نوری یہ کہتا ہے۔ کہ

"اسلام میں ہم نے مسیحیت جیسی نشو و نما اور اپنے گردو پیش کے حالات اور ماحول سے مطابق ہو جانے کی صلاحیت اور اہلیت نہیں دیکھی۔ اسلام آج تک غیر متحرک حالت میں ساکن رہا ہے۔ پرانے فتاویٰ کی زنجیروں میں جکڑے رہنا ترقی کے منافی ہے۔ ہم زمانہ قدیم کے ساکن تصورات اور غیر متحرک معاشرتی اقتصادی اور سیاسی تصورات میں بے بس ہو کر بندھے ہوئے ہیں۔ لیکن زندگی کا یہ اصول ہے کہ جو شے ساکن اور غیر متحرک رہتی ہے وہ لازمی طور پر لازوال پذیر ہو جاتی ہے"۔

(ترکی انقلاب صفحہ 58)

ترکوں کے اس احساس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۲۲ء میں مصطفی کمال اتاترک نے سلطان عبد الحمید کو جو دنیائے اسلام کا خلیفہ تھا۔ ترکی سے ملک بدر کر دیا۔ اور مارچ ۱۹۲۲ء میں اس نے خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ جب دیگر اسلامی ممالک نے خلافت کا خاتمہ دیکھا اور اسلام کے جلال کو غروب ہوتے دیکھا تو انہوں نے اور بالخصوص ہندوستان کے مسلمانوں نے صدائے احتجاج بلند کی۔ لیکن مصطفیٰ کمال نے جواب دیا کہ ہندوستان کی تحریک خلافت کے وجود سے حاصل تھا۔ لیکن انہوں نے اسلامی اتحاد کو ترکی اتحاد پر قربان کر دیا۔ کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ اسلامی خیالات اور دور حاضرہ کے خیالات ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ ایک ترک مصنف نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ

"اگر ترکی قوم مسلمان نہ ہوتی۔ تو یہ اس کے حق میں بہتر ہوتا"۔

ترکی سلطنت جمہوریہ نے ان تمام اسلامی قیود کو اڑا دیا جو ترکی کی ترقی کی راہ میں حامل تھیں۔ کمال اتاترک نے ملکی ضابطہ میں سب سے بڑی تبدیلی یہ کی کہ اسلام کو ترکی جمہوریہ سلطنت کا مذہب نہ بنایا اور یوں امور سلطنت کو قرآن وحدیث کی قیود سے آزاد کر دیا۔ اس کی تعزیرات کی پہلی دفعہ یہ ہے کہ "اسلام سلطنت ترکی کا مذہب نہیں ہے"۔ اور دفعہ 75 میں ہے۔ کہ "کوئی شخص اپنے مذہب یا فرقہ یا رسوم یا فلسفیانہ خیالات کی وجہ سے سزا اور تعذیب کا مستوجب نہ ہوگا"۔ کہاں یہ دفعہ اور کہاں قرآن وحدیث کی شریعت ارتداد جس کی رو سے مرتد کا قتل جائز ہے۔

دیگر اسلامی ممالک کی طرح ترک بھی اپنی مادری زبان کو فراموش کر چکے تھے۔ اور ان کی زبان عربی ہو چکی تھی۔ پس کمال اتاترک نے عربی کو سلطنت سے خارج کر دیا۔ اب نماز آسمانی زبان عربی کے بجائے ترکی میں پڑھی جاتی ہے۔ اور یہ قدم ایسی پالیسی کا پیش خیمہ تھا کہ سلطنت ترکی پر قرآن وحدیث حکمران نہ رہیں۔ بلکہ ترکی کی قومی اور ملی نشوونما اور ترکی سیاسیات کی بنیاد اسلام کی بجائے ترکی قومیت پر قائم ہو۔ ترکوں نے ترکی میں نماز پڑھنے اور مسجدوں میں ترنم سے گانے اور دلنواز باجا بجانے کا حکم دے دیا ہے۔ خطبات عربی زبان کی بجائے ترکی میں ادا ہوتے ہیں۔ خواہ خواجہ حسن نظامی دھلوی مسجدوں کے اندر باجا بجانے کے حکم کو "دشمنوں" کی طرف ہی سے منسوب کریں کیونکہ آپ کے خیال کے مطابق "کوئی انسان خواہ کسی عقیدہ کا ہو یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ کافروں کی طرح مسجدوں میں باجا بجایا جائے۔ ترکی حکومت مذہب اسلام کے خلاف کوئی حکم نہیں دے سکتی"۔

(پرتاپ ۱۱ جولائی ۱۹۲۸ء)

ادھر ہندوستان میں خواجہ حسن نظامی یہ لکھتا ہے۔ ادھر ترکی میں ڈاکٹر عبد اللہ مدیر اخبار اجتہاد اگست ۱۹۲۴ء کی اشاعت میں لکھتا ہے کہ

"اسلام ایک ایسا کرتہ ہے جو اہل عرب کے لئے کاٹا اور بنایا گیا ہے۔ اور جو ہم ترکوں کے گلے میں زبردستی جبر کے ساتھ پہنایا گیا۔ اس نے ہم کو زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ اور ہماری قومی اور ملی نشوونما کی راہ میں حائل ہے۔ ترکی نے اب تمام قیود سے نجات حاصل کر لی ہے"۔

فاعبروا یا اولی البصار۔ ترکی نے عربی رسم الخط کو سلطنت سے خارج کر دیا ہے۔ اور لاطینی رسم الخط اختیار کر لیا ہے۔ مصطفیٰ شکیب بے جو قسطنطنیہ کی یونیورسٹی میں علم نفسیات کا پروفیسر ہے۔ رسم الخط کی تبدیلی کی نسبت یوں رقمطراز ہے۔

"عربی حروف ترکی زبان کے لئے وضع نہیں کئے گئے تھے۔ جس طرح چینی لوہے کی جوتیاں چین کے باشندوں کے پاؤں کے نشوونما میں حائل ہوتی رہیں۔ اسی طرح عربی رسم الخط نے ترکی زبان کو ترقی نہ کرنے دی۔ عربی حروف کا اختیار کرنا ہماری بدقسمتی تھی۔ دور حاضرہ میں مختلف علوم وفنون سائنس کی اصطلاحات ،تلغراف، بنج بیوپار، تجارت، مالیات اور جنگی ضروریات کے لئے نئی اصطلاحات کو وضع کرنے کے لئے عربی ناکافی ثابت ہوئی ہے۔ پس ہمیں ایک نئے رسم الخط کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ہم یہ برداشت نہیں کرسکتے۔ کہ عربی حروف ہمارے بچوں کے ذہنوں اور روحوں کا گلا گھونٹ دیں۔ ہم کو ایک ایسے رسم الخط کی ضرورت ہے جو ہماری زبان کی ترقی اور تکمیل میں مدد ومعاون ہو۔ اور یہ عربی رسم الخط سے نہیں ہوسکتا جو زمانہ قدیم کے قد آور حیوانوں کی طرح بھدی ہے۔ ترکی قوم کی موجودہ جہالت عربی حروف اور رسم الخط کی وجہ سے ہے۔ ان حروف کی بیقاعدگی کی وجہ سے ہمارے بچے تعلیم سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ ترکی رسم الخط ہم کو عربی حروف کے برے نتائج سے بچائے گا۔ اور ہمارے بچوں کو تعلیم کا شوق عود کر آئے گا۔ علاوہ ازیں یہ رسم الخط ترکی کو جو عربی اور فارسی صرف ونحو کے ماتحت مفلوج رہی ہے۔ از سر نو علم وفنون کے سیکھنے میں مدد ومعاون ہوگا"

(Variet Aug/22/1928)

ترکی رسالہ اقدام اپنی اشاعت مئی 1928ء میں لکھتا ہے کہ

"ترکوں نے اسلام قبول کرتے وقت عربی رسم الخط۔ عربی تہذیب دستورات اور قوانین اختیار کرلئے۔ اور اس طرح عربیت کا قدم ترکی سوسائٹی میں جم گیا۔ یہ ترکوں کی بدقسمتی تھی کہ یہ حالات ایک ہزار سال تک رہے۔ لیکن اسلامی دنیا سے عربی زبان کی وجہ سے سائنس اور علوم وفنون گم ہوگئے۔ اسلامی تہذیب ٹوٹتے تارے کی طرح ہے جس کی چمک کا زمانہ نہایت محدود ہوتا ہے۔ ترکی قوم میں ہر طرح کی ترقی کی صلاحیت موجود تھی۔ لیکن اسلامی تہذیب ساکن اور غیر متحرک تھی۔ اور اس کے اختیار کرنے کا نتیجہ ترکوں کے حق میں نہایت مضر ثابت ہوا"۔

اسلام کی وجہ سے ترکوں کا یہ حال ہوگیا تھا کہ استفسار کی جبلّت بالکل ناکارہ ہوگئی تھی۔ ترکی کی سابقہ ذہنیت کی عمدہ مثال ایک خط ہے جو کسی ترکی افسر نے ایک انگریز محقق کو تحریر کیا تھا۔ انگریز محقق نے اس ترکی افسر سے اعداد وشمار طلب کئے تھے۔ جس پر اس کو یہ جواب ملا کہ

"جو بات آپ نے مجھ سے دریافت کی ہے۔ وہ نہ صرف مشکل بلکہ غیر مفید بھی ہے۔ اگرچہ میں مدت طویل سے اس جگہ سکونت پذیر ہوں۔ لیکن میں نے نہ تو گھروں کو شمار کیا ہے۔ اور نہ یہاں کے باشندوں کی تعداد دریافت کی

ہے۔ یہ میرا کام نہیں کہ یہ معلوم کرتا پھروں کہ فلاں اپنے خچر پر کیا لادتا ہے اور فلاں کیا کیا اشیا جہاز کے ذریعہ بھیجتا ہے۔ اس شہر کی گذشتہ تاریخ کے متعلق صرف خدا کو ہی علم ہے۔ کہ اسلام کی تلوار سے پہلے کفار نے کیا گوہ کھایا ہو گا۔ ہمارا ان باتوں کو دریافت کرنا محض بے سود ہے۔ کوئی فلسفہ خدا کی وحدت پر ایمان لانے سے بہتر نہیں۔ اسی نے دنیا ومافیہا کو پیدا کیا۔ کیا یہ بات سزاوار ہے کہ ہم اس کی خلقت کے رازوں کو دریافت کرتے پھریں۔ کیا یہ لائق ہے کہ ہم کہتے پھریں۔ کہ فلاں ستارہ فلاں ستارے سے گرد گردش کرتا ہے۔ اور فلاں دمدار ستارہ اتنے برسوں کے بعد آتا اور پھر جاتا ہے آپ ان باتوں کو رہنے دیں۔ اور ان کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ جس دست قدرت نے ان کو پیدا کیا ہے۔ وہی ان کو سنبھالتا ہے۔ اور وہی ان کو ان کی مقررہ راہ پر چلائے گا"۔

(Quoted by Prof W.James from Sir A.Layord Ninevah & Babylonia)

اللہ! اللہ کہاں یہ اسلامی ذہنیت جو قرآنی آیات (بنی اسرائیل 38 تا 40) کے عین مطابق ہے۔ اور کہاں دور حاضرہ کے ترک۔ ع۔ بہ ہیں تفاوت راز از کجاست تا یکجا۔ گذشتہ تیرہ سال میں ترکی قرون وسطیٰ کے تاریک زمانہ سے نکل کر حیرت انگیز طور پر دور حاضرہ کی ترقی یافتہ قوم بن گئی ہے۔

(6)

اگرچہ افریقہ میں اسلام ایک ہزار (۱۰۰۰) سال سے زائد عرصہ سے جاری ہے۔ اور اس نے ایسے شہروں پر قبضہ کر رکھا ہے جو اس کے غلبہ حاصل کرنے میں ممد ومعاون رہے ہیں۔ تاہم اسلام نے حبشی اقوام کی تعلیم کے لئے مسیحیت کے مقابلہ میں کچھ نہیں کیا۔ مصر اور سوڈان میں اسلام نے سب سے زیادہ ترقی کی ہے۔ لیکن اس کا طریقہ تعلیم وہی دقیانوسی طریقہ سے جو صدیوں سے چلا آیا ہے۔ اور جس کا سب سے عالیشان نتیجہ قاہرہ میں جامع العلوم ازہر ہے یہ جامع قرآن وحدیث اور فقہ کا حصین قلعہ ہے۔ اور دور حاضرہ کے علوم وفنون کا جانی دشمن ہے۔ جبلّت استفسار کو ہر وقت اور ہر حالت میں دبانا تفحص تجسس کے خلاف ہر وقت کارروائی کرنا اس دارالعلوم کا طغرہ امتیاز ہے۔ اس کے علما زمانہ سلف کے نقش قدم پر چلنا اور قرآن وحدیث اور کتب فقہ سے سند لینا موجب سعادت دارین خیال کرتے ہیں۔

لیکن ترکوں کی دیکھا دیکھی ایران اور مصر کے مسلمان بھی اس محدود دائرہ میں رہنا نہیں چاہتے۔ جو خیالات کی وسعت اور آزادی کے خلاف ہے۔ چنانچہ شیخ علی عبدالرزاق جو جامع ازہر کی فیکلٹی کا ممبر ہے۔ اور منصور کی عدالت شرعیہ کا قاضی ہے۔ اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ

"قوانین شرعیہ سیاسی گورنمنٹ کی ہدایت کے لئے وضع نہیں کئے گئے تھے۔ بلکہ ان کا مقصد افراد کی عملی زندگی کی رہنمائی کرنا ہے۔ محمد ﷺ محض ایک رسول تھے۔ جو ایک مذہبی پیغام لے کر آئے تھے۔ آپ کے پیغام کا تعلق سیاسیات سے نہ تھا۔ آپ نے کوئی سلطنت قائم نہ کی تھی۔ آپ دیگر انبیاء کی طرح ایک نبی تھے"۔

(Islam & Foundations of State)

ڈاکٹر طہ حسین آفندی پروفیسر عربی لٹریچر جامع ازہر نے لکھا ہے کہ

"جامع ازہر کے علما چاہتے ہیں کہ سائنس مذہب اسلام کے ماتحت رہے ہم چاہتے ہیں کہ سائنس اور مذہب کو جدا کیا جائے۔ تاکہ سائنس بغیر کسی بے جا مداخلت کے ترقی کرے"۔

(Quoted by levoniont in Islam mentality p.120)

اسی پروفیسر نے 1926ء میں ایک کتاب زمانہ جاہلیت کی شاعری پر تصنیف کی۔ جس کے بعض نتائج راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے خیالات کے خلاف تھے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ

"زمانہ جاہلیت کے شعرا میں سے بعض کا کلام ایسا ہے جو فصاحت وبلاغت میں قرآن کے برابر ہے"۔

حالانکہ کتاب کا تعلق مذہب کے ساتھ نہیں تھا۔ بلکہ شاعری کے ساتھ تھا۔ لیکن اس کا چرچا یہاں تک ہوا کہ مصر کی پارلیمنٹ میں یہ تقاضا کیا گیا کہ پروفیسر طہٰ حسین کو جامع ازہر سے الگ کر دیا جائے۔ ایک ممبر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ایسے جرم کی سزا قرآن کے مطابق سنگساری ہے۔ چنانچہ اس کتاب کی تمام کاپیاں نذر آتش کر دی گئیں۔

(7)

حقیقت تو یہ ہے کہ جبلّت استفسار کی نشوونما اور ترقی اسلامی ممالک میں نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ قرآن وحدیث اس جبلّت کے خلاف ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان ممالک میں خیالات کی آزادی کی ممانعت ہے۔ اور یوں اسلامی ممالک پر ہی کیا منحصر ہے۔ جس جگہ بھی اہل اسلام کی اکثریت ہے۔ وہاں خیالات کی آزادی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کی جاتی ہیں۔ خود ہندوستان میں جہاں قرآن وحدیث کے مطابق حکمرانی نہیں کی جاتی۔ آئے دن ایسی کتابیں بحق ملک معظم ضبط کی جاتی ہیں۔ جن میں اسلام کے خلاف آزادانہ بحث ہو۔ ایسی کتابوں کے مصنفوں پر مقدمات چلائے جاتے ہیں۔ اور جو مسلمان مذہبی جنون کی وجہ سے ایسے مصنفوں کو قتل کر دیتے ہیں۔ ان کو عوام الناس غازی اور شہید کا خطاب دے دیتے ہیں۔ یہ حال اس ملک کا ہے جہاں قرآن وحدیث کے شرعی احکام کے مطابق حکومت نہیں کی جاتی۔ اور جہاں کے مسلمان صدیوں سے غیر مسلم تاثرات سے متاثر ہو چکے ہیں۔ ناظرین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان ممالک میں خیالات کی آزادی تفحص، تجسس اور استفسار کا کیا حشر ہو گا۔ جہاں آئین ملک اور قوانین سلطنت قرآن وحدیث پر ہی مبنی ہیں۔

(8)

لیکن جبلّت استفسار ہماری سرشت کا ایک زبردست حصہ ہے۔ انسانی فطرت اس بات کا تقاضا کرتی ہے۔ کہ ہم ہر بات میں تجسس، استفسار، تفحص اور جستجو کریں۔ پس دورِ حاضرہ کے مسلم نوجوان جن کے اذہان نئی روشنی سے منور ہو چکے ہیں۔ خواہ وہ شمالی افریقہ کے رہنے والے ہوں۔ خواہ مراکو،

ترپولی، مصر، کنعان، ایران، عراق، ہندوستان ترکی چین کے باشندے ہوں۔ فی زمانہ اس بات پر اصرار کرتے ہیں۔ کہ ان کو خیالات کی آزادی نصیب ہو۔ چنانچہ علامہ ڈاکٹر اقبال کہتے ہیں کہ

"گذشتہ پانچ سو سال سے اسلامی خیالات ساکن رہے ہیں۔ ان تمام صدیوں میں جب ہمارے دماغ سو رہے تھے۔ مغرب جاگتا رہا اور اس کا ذہن کام کرتا رہا۔ قرون وسطیٰ میں اسلامی دینیات مکمل ہو گئی۔ لیکن اس وقت سے زمانہ نے کروٹ لے لی ہے۔ اور انسانی فلسفہ وغیرہ بہت آگے نکل گئے ہیں۔ نئے نظریہ جات قائم ہو گئے ہیں۔ اور پرانی باتیں نئے خیالات کی روشنی میں نظر آتی ہیں۔ اور نت نئے حل طلب مسائل اپنا منہ دکھا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی عقل زمان و مکان اور علت و معلول کی قیود سے بالا ہو گئی ہے۔ اور اب اسلام کی نئی پود جو ایشیا اور افریقہ کے ممالک میں ہے یہ چاہتی ہے کہ نئے خیالات کی روشنی میں اسلامی عقیدہ نظر آئے"۔

صفحہ 7۔

پھر علامہ موصوف کہتے ہیں کہ

"جو دینیات مردہ فلسفہ کی اصطلاحات پر قائم ہو۔ وہ ان اشخاص کے لئے کارآمد نہیں ہو سکتا جن کے خیالات دور جدید سے تعلق رکھتے ہیں"

صفحہ ۹۲۔

اسی طرح مشہور مصنف ایس خدا بخش مرحوم اپنی کتاب (Essays. Indian & Islamic) میں کہتا ہے کہ جو

"شخص یہ خیال کرتا ہے کہ جو مذہبی اور سوشل احکام ہم کو تیرہ سو (۱۳۰۰) سال ہوئے ملے تھے۔ وہ اب بھی بغیر کسی تبدیلی کے تمام کے تمام دور حاضرہ پر عاید ہو سکتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے اور فریب خوردہ ہے۔ پچاس (۵۰) سال سے اس ایک بات پر ہندوستان کی نئی پود اور پرانی نسل کے خیالات میں جنگ ہو رہی ہے۔ قدیم خیالات روز بروز زوال پذیر ہو رہے ہیں۔ اور بوسیدہ ہو کر طبعی موت مر رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص ہوا کے طوفان کے ساتھ یا سمندر کی لہروں کے خلاف جنگ کر سکتا ہے تو وہ ترقی کے ساتھ بھی جنگ کر سکتا ہے۔ تعلیم یافتہ مسلمان چاہتے ہیں کہ ان کے دینی عقائد وغیرہ کی اصلاح عقلِ سلیم کے مطابق ہو سکے۔ وہ بزرگان سلف کی سند اور اقوال کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کو تیار نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس ان کی سند کو وہ دلیرانہ چیلنج کرتے ہیں۔ وہ اس امر کا اقدام قومیت، ترقی، تہذیب، اور کلچر کے نام سے کرتے ہیں"۔

چنانچہ ترکی مصنف جلال نوری بے اپنی کتاب ترکی انقلاب میں بے مثل جرات کو کام میں لا کر لکھتا ہے

> "میری رائے تو یہ ہے کہ قرآن کا کتابی صورت میں جمع ہونا نہ تو قابل تعریف بات تھی اور نہ مفید تھی۔ ہمیں اس بات کا علم نہیں کہ رسول نے اس کے جمع کئے جانے کا کبھی حکم بھی دیا تھا۔ بہر حال خلیفہ عثمان کی یہ سعی اور کوشش چنداں ستائش کے قابل بھی نہیں۔ قرآن میں چند احکام اور ہدایات موجود ہیں۔ لیکن یہ احکام ضرورت کے مطابق نازل ہوتے تھے۔ اور ان کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق بھی نہیں تھا۔ قرآن کا یہ مقصد نہیں تھا کہ ان احکام کو ایک جا ترتیب دے کر کتابی صورت میں جمع کیا جائے۔ نبی ﷺ نے ایسا حکم کبھی نہیں دیا تھا اور نہ آپ کا یہ ارادہ اور مقصد تھا۔ لیکن مولف قرآن نے اس بات کو نظر انداز کر دیا۔ قرآن کا ایک ایک حکم کسی خاص وقت زمانہ اور موقعہ سے تعلق ہے"۔

(صفحہ 130)

پس اسلام کی تاریخ میں پہلی دفعہ دورِ حاضرہ میں مذہب کو قومیت اور سیاست سے جدا کیا جارہا ہے۔ مذہبی عقاید کو انسان کی ضمیر سے متعلق کیا جارہا ہے تاکہ قرآنی احکام انسانی زندگی کے ہر شعبہ کی ادنیٰ تفصیلات پر واحد حکمران نہ رہیں۔ اور جبلّت استفسار بغیر کسی روک ٹوک کے اپنے اقتضا کو پورا کرنے کے لئے تفحص اور تجسس سے کام لے سکے۔

نتیجہ

سطور بالا سے یہ ظاہر ہو گیا ہو گا کہ اسلام جبلّت استفسار کو اپنے اختیار اور رعب سے دباتا ہے۔ اس کی نشوونما اور ترقی کی راہ میں روکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔ اسلامی تاریخ ہمارے اس نتیجہ کی موید ہے کہ اسلامی ممالک میں خیالات کی آزادی کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا جہاں تک اس جبلّت کا تعلق ہے اسلام دین فطرت کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

اس کے برعکس مسیحیت اس بات پر مصر ہے کہ "سب باتوں کو پرکھا اور آزمایا جائے۔ اور جو بہتر ہو اس کو اختیار کیا جائے"۔ وہ تجسس تفحص، استفسار، کی نشوونما اور علم کی ترقی کی خواہاں ہے۔ مسیحیت کی تاریخ اس امر کو عیاں کر دیتی ہے۔ کہ اس کے زیر سایہ فلسفیانہ نظریئے، محققانہ کارنامے علمی مباحثات وغیرہ پھلتے پھولتے رہے ہیں۔ لہٰذا مسیحیت ایک واحد مذہب ہے جو حقیقی معنوں میں دینِ فطرت کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔

فصل ہفتم

جبلّت اجتماع پسندی

جبلّت اجتماع پسندی کی خصوصیات

انسانی فطرت ایسی واقع ہوئی ہے کہ جب مختلف افراد طبعاً آپس میں مل جل کر رہنا پسند کرتے ہیں۔ اور تنہائی سے نفرت رکھتے ہیں۔ جاندار اور بے جان اشیاء میں یہ امتیاز ہے کہ جانداروں میں تمدنی گروہ بندی ہے۔ اس جبلّت کا اثر ہماری معاشرتی زندگی پر بے اندازہ ہوتا ہے۔ ہم طبعی طور پر اپنے ہم جنسوں کی تلاش کرتے ہیں اور ان سے رفاقت رکھنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکیلی کوٹھڑی میں بند ہو جانے کی سزا ناقابل برداشت ہوتی ہے۔

(۲)

انسانی تاریخ میں کوئی ایسا زمانہ نہیں ملتا۔ جب مختلف افراد قبائل میں نہ رہے ہوں۔ انسانی تاریخ یہ ظاہر کرتی ہے۔ کہ تہذیب اور ترقی کی ابتدائی منازل میں افراد کو کوئی اہمیت اور وقعت حاصل نہ تھی۔ ہر شخص قبیلہ کا محض ایک فرد تھا اور بس اس کی ہستی بذات خود کچھ قدر اور وقعت نہ رکھتی تھی۔ قبیلے کی ہستی اور بقا اور قیام ہی اعلیٰ مقاصد خیال کئے جاتے تھے۔ اگر افراد کی کچھ ہستی تھی۔ تو محض قبیلے کی خاطر تھی۔ قبیلہ سے الگ کسی فرد کی صفر برابر بھی قدر نہ تھی۔ اس کی مثال ہمارے ملک کی ذاتوں کی درجہ بندی میں پائی جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی اچھوت ذات کے گھر پیدا ہوا ہے۔ تو وہ اچھوت تصور کیا جاتا ہے۔ بطور ایک فرد کے وہ کچھ ہستی نہیں رکھتا۔ خواہ وہ بذات خود کیسا ہی پاک اور نیک انسان کیوں نہ ہو۔

(3)

ان ابتدائی منازل سے ترقی کر کے انسان اس منزل پر پہنچتا ہے جب قبیلہ کی جگہ قوم اور ملک کی ہستی اور بقا اعلیٰ ترین مقاصد خیال کئے جاتے ہیں۔ اگر کوئی فرد بشر قوم اور ملک کی بقا کے لئے مفید ہے۔ تو وہ وقعت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی فرد قوم اور ملک کی زندگی سے جدا ہو کر زندگی بسر کرنا چاہے۔ تو وہ کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ اگر وہ جیتا ہے تو قوم اور ملک کی بقا کے لئے جیتا ہے اور اگر قومی اور ملکی مفاد اس کی موت سے حاصل ہو سکتے ہوں۔ تو وہ بے دریغ موت کا لقمہ کیا جاتا ہے۔ اندریں حالات کسی انسان کو یہ آزادی حاصل نہیں ہوتی کہ قومی، ملی، اور ملکی رسوم ورواج کو ترک کر دے یا نئے رسوم یا نئے آئین کو وضع کرے یا کسی نئے مذہب کو اختیار کرے۔ اگر کوئی فرد اس قسم کی بات کرنے کی جرات کرتا ہے۔ تو وہ قوم وملت اور ملک سے خارج کر دیا جاتا ہے یا قتل کر دیا جاتا ہے۔

(4)

انسانی ترقی کی آخری اور انتہائی منزل پر افراد کی قدر اور وقعت افراد کے طور پر کی جاتی ہے اس منزل پر ہر ایک فرد بشر کو ایک آزاد اور ذمہ وار ہستی تسلیم کیا جاتا ہے۔ جو بقائے نوع کی خاطر یا قبیلہ یا ملت یا قوم اور ملک کی خاطر پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے برعکس قبیلہ اور قوم اور ملک اس کی روحانی ترقی کا وسیلہ اور ذریعہ خیال کئے جاتے ہیں۔

لیکن یہ امر ضروری ہے کہ اس انتہائی منزل میں انانیت اور جبلّت اجتماع پسندی میں باہم صلح ہو۔ اور دونوں پہلو افراط و تفریط سے خالی رہیں۔ جس طرح ابتدائی منازل میں جبلّت اجتماع پسندی انانیت کو دباتی رہی ہے۔ اب ترقی کی اس انتہائی منزل پر انانیت اس جبلّت اجتماع پسندی کو دبانے نہ پائے۔ بلکہ دونوں پہلو بہ پہلو اور دوش بدوش ہو کر افراد اور اقوام کو ان کی اعلیٰ ترین منازل کی جانب چلنے میں ممد و معاون ہوں۔

جبلّت اجتماع پسندی اور دین فطرت کے لوازمات

سطور بالا سے ظاہر ہو گیا ہو گا۔ کہ دینِ فطرت کا یہ کام ہے کہ اس بات کا خیال رکھے کہ اس اجتماع پسندی کی جبلّت افراد کی ہستی کو دبانے نہ پائے۔ بلکہ ہر فرد کو ذمہ دار آزاد واخلاقی ہستی قرار دے تا کہ ہر فرد اپنے قبیلے، جماعت، ملت، قوم، اور ملک کی خدمت ترقی اور بہبودی میں اپنی نجات کی تلاش کرے۔

دینِ فطرت کا یہ بھی کام ہے۔ کہ ایسے جامع اصول وضع اور قائم کرے۔ جن کا اطلاق ہر زمانہ، قوم اور ملک کے انسانی تمدن اور معاشرت کے مختلف شعبوں پر ہو سکے۔

دینِ فطرت کا یہ بھی کام ہے کہ خدا کی ذات کی نسبت ایسی تعلیم دے جو اس جبلّت کے اقتضا کے مطابق ہو۔ اور ایسے اصول بتلائے جس سے خدا اور انسان کے باہمی تعلقات میں رفاقت کا سلسلہ قائم اور جاری رہ سکے۔

مسیحیت اور افراد کی وقعت

یہ ایک تواریخی حقیقت ہے کہ کلمتہ اللہ اس دنیا کے پہلے معلم تھے جنہوں نے کل عالم کو یہ سکھلایا کہ ہر فرد بشر ایک ذمہ دار اخلاقی ہستی ہے۔ آپ نے یہ تعلیم دی کہ خدا باپ ہر فرد بشر سے لازوال محبت رکھتا ہے۔ اور ہر ایک بشر کی زندگی کا خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ بچہ ہو یا بوڑھا، خفیف سے خفیف واقعہ بھی خدا کے علم اور محبت کا مظہر ہے (متی ۱۰: ۳۰)۔ آپ نے فرمایا کہ حقیر ترین انسان کی روح کی قدر نہ صرف تمام دنیا سے زیادہ ہے (مرقس ۸: ۳۶)۔ بلکہ وہ ایسی قیمتی شے ہے کہ اس کو حاصل کرنے کے لئے خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے کو اس دنیا میں بھیجا۔ تا کہ کسی فرد بشر کی روح ہلاک نہ ہو۔ بلکہ ہمیشہ کی زندگی پائے (یوحنا ۳: ۱۶)۔ آپ نے یہ تعلیم دی کہ سب سے برا وہ شخص ہے جو کسی ادنیٰ سے ادنیٰ انسان کی روحانی ترقی میں رکاوٹ کا باعث

ہوتا ہے۔ اور فرمایا"جو کوئی ان چھوٹوں میں سے کسی کو ٹھوکر کھلاتا ہے۔ اس کے لئے یہ بہتر ہے کہ ایک بڑی چکی کا پاٹ اس کے گلے میں لٹکایا جائے ۔اور وہ گہرے سمندر میں ڈبو دیا جائے۔ خبردار ان چھوٹوں میں سے کسی کو حقیر نہ جاننا۔ تم کیا سمجھتے ہو؟ اگر کسی آدمی کی سو(۱۰۰) بھیڑیں ہوں۔ اور ان میں سے ایک بھٹک جائے تو کیا وہ ننانوے(۹۹) کو چھوڑ کر اور پہاڑوں پر جا کر اس بھٹکی ہوئی کو نہ ڈھونڈے گا؟ اور اگر ایسا ہو کہ اسے پائے تو میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ ان ننانوے(۹۹) کی نسبت جو بھٹکی نہیں۔ اس بھیڑ کی زیادہ خوشی کرے گا۔ اسی طرح تمہارے باپ (پروردگار) کی جو آسمان پر ہے۔ یہ مرضی نہیں کہ ان چھوٹوں میں سے ایک بھی ہلاک ہو" (متی۱۸: ۴۸؛لوقا۹: ۴۸وغیرہ)۔ منجی عالمین اس دنیا میں اس لئے آئے تاکہ ہر زمانہ اور ہر ملک اور قوم کے ہر مرد اور ہر عورت، ہر بچے، اور ہر جوان اور بوڑھے کو نجات دیں(۱۔یوحنا۶: ۱۲۔۱۵)۔ جو کوئی بیٹے پر ایمان لاتا ہے۔ ہمیشہ کی زندگی اس کی ہے(یوحنا۳: ۲۶؛۵: ۲۴؛۶: ۳۷؛۷: ۳۸؛۱۰: ۲۷وغیرہ)۔ انجیل جلیل ہم کو تعلیم دیتی ہے کہ "خدا کے ہاں کسی کی طرفداری نہیں ،جلال اور سلامتی ہر ایک نیکوکار کو ملے گی" (رومیوں ۲: ۱۰)۔ ہر فرد بشر خدا کے نزدیک قدر اور وقعت رکھتا ہے۔ اور مسیح ہر ایک کا منجی ہے (رومیوں۵: ۸؛۶: ۲۳؛۹: ۳۲؛۱۔کرنتھیوں۸: ۱۲وغیرہ)۔ مقدس پولُس فرماتا ہے کہ خدا نے دنیا کے کمینوں اور حقیروں کو بلکہ بے وجودوں کو نجات کے واسطے چن لیا(۱۔کرنتھیوں ۳: ۱۶)۔ پس ہر ایک شخص خواہ وہ ادنیٰ ہو یا اعلیٰ۔ خواہ امیر ہو یا غریب، خواہ بڑا ہو چھوٹا، خواہ مرد ہو خواہ عورت، جو مسیح میں ہے وہ نیا مخلوق ہے۔ اس میں سے پرانی چیزیں جاتی رہیں۔ دیکھو وہ نئی ہو گئیں (۲۔کرنتھیوں ۵: ۱۷وغیرہ وغیرہ)۔

جناب مسیح کا ایک درخشاں کارنامہ یہ ہے کہ جہاں آپ کسی انسان کی بری عادتوں کے انبار میں کسی نیک خصلت کا شمہ (قلیل مقدار) بھی دیکھ لیتے۔ آپ اس کوشش میں رہتے کہ وہ نیک عادت روز بروز بڑھتی جائے اور یہاں تک ترقی کر جائے کہ رفتہ رفتہ اس کی انانیت اور ذات کے اظہار کا وسیلہ ہو جائے۔ مثلاً حضرت پطرس جیسے جلد باز اور بزدل شخص، حضرت یوحنا جیسے غصہ وار اور تند مزاج شخص۔ علیٰ ہذا القیاس دیگر حواریوں کو آپ نے رسالت کے عہدہ پر ممتاز فرمایا"اور ان سے آپ نے اس قدر محبت کی" (یوحنا۱۵: ۱۲۔۱۵؛۱۷: ۱۲) کہ ان کی تمام بدعادتیں ان سے دور ہو گئیں۔ اور ان کی نیک خوبیاں ایسی ترقی کر گئیں، کہ وہ ان کی ذات کا جوہر ہو گئیں۔ اور ان کی بدولت تمام اکناف عالم میں مسیحیت پھیل گئی۔ اسی طرح دیگر اشخاص کے ساتھ بھی آپ نے یہی سلوک کیا(مرقس ۱۲: ۴۱۔۴۴؛۱۴: ۳۔۹؛۱۰: ۱۷۔۲۲؛متی۲۶: ۳۶۔۴۱؛لوقا۲۳: ۳۴؛۱۵: ۱۱؛۱۹: ۸۔۹وغیرہ)۔ آپ نے فرمایا کہ اگر کسی بدترین گنہگار شخص میں نیکی کا اتنا شمہ باقی رہا ہو کہ اس نے ازراہ رحم اپنی زندگی میں ایک دفعہ بھی ترس کھا کر کسی پیاسے کو پانی کا پیالہ پلایا ہو۔ تو ایسے گنہگار کے لئے بھی اُمید باقی ہے کہ وہ کسی دن مقدسوں کی صف میں شمار ہو جائے(مرقس ۹: ۴۰۔۴۱وغیرہ) آپ نے ایک تمثیل کے ذریعہ یہ حقیقت منکشف فرمائی۔ کہ اگر کسی شخص میں رتی بھر لیاقت نیکی کرنے کی موجود ہو اور وہ اس لیاقت کو استعمال کرے اور یوں اپنی انانیت کو ترقی دے۔ تو وہ اپنی ذات کا اظہار اس رتی بھر لیاقت سے اسی طرح سے کر سکتا ہے جس طرح ایک دوسرا شخص جس کی ذات میں نیکی فراواں ہو(متی ۲۴: ۱۴،۲۳)۔ غرضیکہ مسیحیت کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ ہر انسان کو موقعہ اور توفیق عطا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ تاکہ دنیا کا ہر فرد بشر اپنی انانیت کا جائز طور پر اظہار کر سکے۔ اور اپنی ذات کو ترقی اور تکمیل دے سکے۔ جس سے ظاہر ہے کہ مسیحیت دینِ فطرت ہے۔

اسلام اور افراد کی وقعت

قرآن غلامی کی قبیح رسم کو جائز قرار دیتا ہے۔ قرآن خود کہتا ہے کہ "غلام پرائے کے پس میں ہوتا ہے اور کسی شے پر اختیار نہیں رکھتا" (سورہ نحل آیت 77، سورہ روم 27)۔ تاہم وہ نہ صرف غلامی کو مباح قرار دیتا ہے بلکہ اس کو جہاد وغیرہ کے مرغبات و محرکات حسنہ میں شمار کرتا ہے۔ مال غنیمت میں سے باندیوں کو حاصل کرنا (نسا29) اور ان میں سے لاتعداد کے ساتھ مباشرت کرنا (نسا آیت 3 احزاب 5 وغیرہ)۔ خواہ وہ منکوحہ عورتیں ہی کیوں نہ ہوں (نسا28) قرآن کی رو سے جائز ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ قرآن نے ان کے ساتھ نیک سلوک روا رکھنے کا حکم دیا ہے (نسا آیت 40)۔ اور اگر غلام زر فدیہ ادا کر دے۔ تو وہ آزاد ہو سکتا ہے (نور 33) لیکن قرآنی بنا پر ہم کسی ایسے مستقبل زمانہ کا خیال نہیں کر سکتے۔ اور (نہ قرآن نے ایسا خیال کیا ہے) جب غلامی بالکل بند ہو جائے گی اسلامی ممالک میں غلامی بند نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ قرآن و حدیث نے اس کو مباح قرار دیا ہے۔ اور اسلامی شرع اس کو جائز قرار دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام خالص اسلامی ممالک میں اسلام کے تیرہ سو (۱۳۰۰) سال گذرنے پر بھی غلاموں کی منڈیاں ہر جگہ موجود ہیں۔

(۲)

اسلام نے انسان کو اخلاقی طور پر بھی آزاد ذمہ دار ہستی قرار نہیں دیا۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے "جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو وہاں کے دولتمندوں کو حکم دیتے ہیں۔ پھر وہ اس میں نافرمانی کرتے ہیں۔ تب ان پر وعدہ عذاب ثابت ہو جاتا ہے۔ پھر ہم ان کو اکھاڑ پھینکتے ہیں" (بنی اسرائیل آیت 17)۔ "ہم نے (اللہ) نے آدمیوں اور جنوں میں سے اکثروں کو دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے" (اعراف 178)۔ "اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگوں کو راہ پر کر دیتا۔ اور وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے مگر جس پر تیرے رب کا رحم ہوا۔ اللہ نے ان کو اختلاف کرنے کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔ اور تیرے رب کی بات پوری ہوئی۔ کہ البتہ میں جنوں اور آدمیوں سب سے دوزخ کو بھر دوں گا" (ہود ۱۲۰)۔ "اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک ہی دین پر کر دیتا۔ لیکن وہ جس کو چاہے گمراہ کرے اور جس کو چاہے ہدایت دے" (نحل 38و55، مجادلہ ۲۲، نجم 44، انعام 36و39و105، قمر 49، آل عمران 139، اعلیٰ ۲، انفال 17، توبہ 51، رعد 30، ابراہیم 4، کہف 101، وغیرہ وغیرہ)۔

آیات مندرجہ بالا سے ظاہر ہے کہ قرآن کے مطابق اللہ نے انسان کو ایک آزاد خود مختار اخلاقی ہستی کے طور پر خلق نہیں کیا۔ بے شمار احادیث صحیحہ ان قرآنی آیات کی مصدق و موید ہیں۔ یہ تمام کی تمام اس ایک آیت کی صدائے بازگشت ہیں کہ "یہ نصیحت ہے کہ پس جو کوئی چاہے اپنے رب کی طرف سے راہ پکڑے۔ لیکن تم چاہ نہیں سکتے۔ جب تک اللہ نہ چاہے" (دہر 26و30)۔ اللہ نے تم کو اور تمہارے افعال اور کاموں کو پیدا کیا (صافات 94)۔ جبریوں کا یہی عقیدہ ہے کہ انسان کسی فعل کا فاعل خود مختار نہیں ہے۔ اور انسان وہی کرتا ہے جو اللہ کا حکم ہوتا ہے۔ یہی عقیدہ قرآن اور احادیث کے مطابق ہے اور راسخ الاعتقاد مسلمانوں کا ہے۔ اگرچہ فرقہ قدریوں نے اس بات کو عقلِ سلیم کے خلاف پایا۔ اور اس کے منکر ہو گئے۔ لیکن وہ اسلام میں شروع ہی سے بدعتی متصور ہوتے رہے۔ چنانچہ مشکواۃ باب القدر میں ابن عمر سے روایت ہے کہ آنحضرت نے فرمایا کہ

"قدریہ اسلام میں ایک مجوسی فرقہ ہے۔ اگر یہ بیمار ہو جائیں۔ تو ان کی عیادت مت کرو۔ اگر یہ مر جائیں تو ان کا جنازہ مت پڑھو"۔

(3)

اسلام فخر کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے اصول امور سلطنت کے ساتھ ایسے وابستہ ہیں کہ قرآن وحدیث کے اصول سلطنت کے ہر شعبہ پر تاابد عائد ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد اقبال کہتے ہیں کہ

"ہمارا مذہبی اصول یہ ہے کہ وہ سیاسی اور معاشرتی انتظام جو اسلام کے نام سے موسوم ہے مکمل اور ابدی ہے"۔

(اسلام اور احمدیت صفحہ 15)

پس کوئی شخص جو ایک دفعہ اسلام کا حلقہ بگوش ہو چکا ہو۔ دائرہ اسلام سے باہر نہیں جا سکتا چنانچہ (سورہ بقر) میں ہے جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے خود مرتد ہوا اور کفر ہی میں مر گیا۔ تو ایسوں ہی کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ وہی دوزخی ہیں۔ اور اس میں ہمیشہ رہیں گے (مایدہ 59 وغیرہ)۔ حدیث اور شرع اسلام میں مرتد واجب القتل ہے۔ پس بروئے قرآن کفار کو جبریہ اسلام میں داخل کرنا اور جب وہ اس میں داخل ہو جائے۔ اس کو جبریہ اپنی حدود سے باہر نکلنے نہ دینا اسلام کا خاصہ ہے۔ علامہ محمد اقبال جیسا شخص بھی اس نظریہ کا قائل ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ

"اسلام کا یہ طرز عمل اصلاً علم الحیات پر مبنی ہے۔ جہاں ایک گروہ کے افراد فطرتاً یا معقول استدلال کی بنا پر یہ محسوس کرتے ہیں۔ کہ اس معاشرتی نظام کی حیات خطرے میں ہے۔ جس کے وہ خود ایک رکن ہیں یہ مدافعانہ احساس علم الحیات کے معیار پر قابل قدر ہے۔ اس ضمن میں ہر فکر اور ہر عمل کا فیصلہ اس بنا پر کرنا چاہیے کہ اس سے نظام کی زندگی کی ترقی ہوتی ہے یا تنزل۔ زیر بحث مسئلہ یہ نہیں کہ آیا ایک شخص کو کافر قرار دینے والے فرد یا قوم کا طرز عمل اخلاقاً معیوب ہے۔ یا مستحسن (نیک، پسندیدہ) بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آیا یہ بات نظام کے حق میں زندگی بخش ہے یا زندگی کش"

(اسلام اور احمدیت صفحہ 10)

بالفاظ دیگر اسلام ابھی تک اس ابتدائی منزل سے آگے نہیں بڑھا۔ جس مرحلے پر (جیسا ہم اس فصل کی ابتدا میں لکھ چکے ہیں) قوم اور ملک کی زندگی اور بقا ہی اعلیٰ ترین مقصد خیال کیا جاتا ہے۔ اور مختلف افراد کی زندگی کی وقعت کا معیار فقط یہ ہوتا ہے کہ "آیا ان کا وجود نظام کے حق میں زندگی بخش ہے یا زندگی کش ہے"۔ اس منزل پر کسی شخص کو یہ آزادی حاصل نہیں ہوتی۔ کہ قومی خیالات اور رسوم کو ترک کر دے۔ یا کسی نئے مذہب کو اختیار کر لے۔ اور مذہب اور حکومت دو جداگانہ باتیں نہیں ہوتیں۔ بلکہ ایک ہی شے کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر اقبال لکھتے ہیں

"اسلامی تاریخ کے دوران میں مذہب اور حکومت کی علیحدگی محض فرائض کی تقسیم تک ہی محدود ہے۔ لیکن اس علیحدگی سے خیالات وافکار کا اختلاف مقصود نہیں ہوا۔ اسلامی ممالک میں حکومت اور مذہب کی علیحدگی کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان آئین سازوں کو یہ آزادی حاصل ہے۔ کہ اہل اسلام کے ان خیالات کی پروانہ کریں۔ جن کی نشوونما روحانیت اسلام کے گہوارہ میں صدیوں تک تربیت پانے کا نتیجہ ہے۔ صرف تجربہ ہی ثابت کرے گا۔ کہ یہ نظریہ ترکی جدید میں کہاں تک کامیاب ہوسکتا ہے"۔

(اسلام اور احمدیت صفحہ 39)

پھر علامہ موصوفہ کہتے ہیں۔ کہ

"مذہبی طور پر اسلام کے استحکام کی بنیاد اس وقت متزلزل ہوجاتی ہے جب مسلمان ارکانِ دین اور اس کے بنیادی اصول میں سے کسی ایک اصول یا رکن کے خلاف سرکشی کریں۔ اسی ابدی استحکام کی خاطر ہی اسلام یہ برداشت نہیں کرسکتا۔ کہ کوئی سرکش گروہ اس کے اپنے دائرہ کے اندر پیدا ہو"۔

(ایضاً صفحہ 44)

مولانا ظفر علی خان مرزائے قادیانی کے بارے میں مسلمانان عالم کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ہندوستان میں اگر اسلامی حکومت ہوتی، تو ممکن نہ تھا، کہ ملت اسلامیہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس قسم کا خطرناک ملحدہ جو نہ خدا کا قائل ہو نہ قرآن کا۔ اور جو حطام (ٹوٹی پھوٹی چیز، کوڑا کرکٹ) دینوی کی خاطر اسلام کی سیز دہ (تیرہ) صد سالہ روشن حقیقتوں کو جھٹلانے میں ذرا باک نہ رکھتا ہو۔ یوں کھلے بندوں چھوڑ دیا جاتا ۔۔۔۔الخ"۔

(ارمغان قادیان صفحہ 181)

ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی اس پر صادر کرتے اور کہتے ہیں کہ

"یہ صحیح ہے کہ جس صورت میں بدعتی عقائد رکھنے والے انسان کا وجود نظام معاشرت کے لئے باعث خطرہ بن جاتا ہے۔ تو اس وقت ایک خود مختار اسلامی حکومت اس کے خلاف یقیناً کارروائی کرے گی"۔

(اسلام اور احمدیت صفحہ 11)

ایک اور جگہ علامہ موصوف لکھتے ہیں کہ

"اسلام ایک واحد نظام ہے جس کا تار پود سیاسیات اور دینیات ہے۔ اسلام میں یہ دونوں جداگانہ نہیں ہیں۔ بلکہ دونوں در حقیقت ایک ہی ہیں۔ فرق صرف زاویہ نگاہ کا ہے۔ اگر کسی اسلامی مسئلہ کو ایک نکتہ نگاہ سے دیکھا جائے گا تو وہ سیاسیات سے متعلق ہو گا۔ لیکن اگر اسی مسئلہ کو دینی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے گا تو اس کا تعلق دینیات سے ہو گا"

(Religious Thought in Islam p.146)

اسلام اور سلطنت کا باہمی ارتباط اور اختلاط اور در حقیقت قرآن حدیث اور فقہ کا اصل الاصول ہے۔ اور اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے۔ کہ اسلام اس منزل سے آگے قدم نہیں مار سکتا۔ جس میں افراد کی قدر اور منزلت صرف اس بنا پر ہوتی ہے کہ وہ ایک خاص نظام کی قوت اور استحکام کا باعث ہوتے ہیں۔ قرآن وحدیث کے اصول بنی نوع انسان کی ترقی کے اس انتہائی مرحلہ سے قطعاً ناواقف ہیں۔ جس منزل پر افراد کی قدر اور وقعت بطور ایک آزاد خود مختار، اور ذمہ وار ہستی کے ہوتی ہے اور جس پر مسیحیت پہنچ چکی ہے۔

فصل دوم میں ہم نے ذکر کیا تھا، کہ اسلام میں خدا کی تنزیہ پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ انسان کی ہستی کی قدر و وقعت کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ فصل سوم میں نے دیکھا تھا۔ کہ اسلام میں عورت کی ہستی فرقہ اناث (اُنثی کی جمع عورتیں) کے لئے وبال جان ہے۔ فصل چہارم میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اسلام کی نظر میں بچے کچھ حقوق نہیں رکھتے۔ فصل پنجم میں ہم نے دیکھا تھا۔ کہ اسلام کی نظر میں غیر مسلم اقوام وافراد کی رتی بھر وقعت نہیں۔ اور فصل ششم میں ہم نے اسلامی تاریخ کی ورق گردانی کر کے یہ ثابت کیا تھا کہ اسلام نے کسی فرد کو خیالات کی آزادی کا اختیار نہیں دیا۔ اس فصل میں ہم نے دیکھا ہے کہ اسلام اس سطح پر پہنچا ہی نہیں۔ جس پر افراد کو آزاد خود مختار ہستی تسلیم کیا جاتا ہے۔ غرضیکہ اسلام کے جس پہلو سے بھی انسان کی ہستی پر نظر کرو۔ قرآنی تعلیم کے مطابق انسان کی زندگی کی قدر، وقعت اور منزلت سرے سے موجود ہی نہیں۔ لیکن دینِ فطرت کا یہ کام ہے کہ اس بات کا لحاظ رکھے۔ کہ جبلّت اجتماع پسندی افراد کی ہستی کو دبانے کی بجائے ہر فرد بشر کو آزاد ذمہ وار اور اخلاقی ہستی قرار دے۔ یہ کام مسیحیت بطرز احسن سر انجام دیتی ہے۔ لیکن اسلام اس بات کے نزدیک بھی نہیں جاتا۔ لہٰذا مسیحیت ہی دینِ فطرت ہے۔

جبلّت اجتماع پسندی اور انانیت

مسیحیت کی یہ خصوصیت ہے کہ جہاں وہ یہ تعلیم دیتی ہے کہ ہر فرد بشر بذات خود قدر اور وقعت رکھتا ہے۔ وہاں یہ بھی تلقین کرتی ہے کہ ہر فرد بشر اپنی جماعت قوم اور ملک کے ذریعہ ہی اپنی نجات حاصل کر سکتا ہے (یعقوب ۱: ۲۷؛ متی ۲۵: ۳۱)۔ ہر شخص پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ وہ اپنے ابنائے وطن کی خدمت کرے۔ اور تمدنی تعلقات معاشرتی معاملات اور ملک اور قومی اور ملی امور کے ذریعہ اپنی انانیت اور شخصیت کی نشوونما اور تکمیل کرے (متی

۲۰: ۲۵۔۲۸)۔ کلمتہ اللہ کی تعلیم کے مطابق انسان کی شخصیت تب ہی کاملیت کی طرف گامزن ہو سکتی ہے۔ جب ہم سوشل تعلقات پر مسیحی اصول کا اطلاق کریں گے (یعقوب ۲: ۱۶وغیرہ)۔ ہر فرد کی روحانی حالت صرف سوسائٹی اور جماعت کے ذریعہ عروج کے کمال تک پہنچ سکتی ہے۔ جب ہم خلق خدا کی خدمت کرنے کا بیڑا اٹھاتے ہیں (گلتیوں ۵: ۱۳۔۱۴؛ متی ۲۳: ۱۱؛۱۔یوحنا۴: ۲۰) یا جماعتی ملی، قومی، سیاسی، تمدنی، اقتصادی، اور دیگر سوشل مقاصد امور اور تعلقات کو مسیحی اصول کے مطابق چلانے کا ذمہ لیتے ہیں۔ (متی ۲۵: ۱۵۔۳۰)۔ تب ہم اپنی شخصیت کی بھی نشوونما ترقی اور تکمیل کرتے ہیں (مرقس ۸: ۳۵؛ متی ۱۶: ۲۶وغیرہ)۔ کوئی بشر جماعتی تعلقات کے بغیر خدا کی خدمت نہیں کر سکتا (متی ۲۵: ۴۰؛ ۱۰: ۴۰؛ لوقا ۱۶: ۱۳؛ رومیوں ۱۴: ۱۸۔۱۹؛ ۱۔یوحنا ۳: ۱۵۔۱۸)۔ کلمتہ اللہ نے ہم کو سکھلایا ہے کہ اگر تم خدا کی محبت کا اظہار کرنا چاہتے ہو۔ تو خلق خدا سے محبت کرو (متی ۲۲: ۳۸۔۳۹؛ لوقا ۱۰: ۲۵۔۳۷ وغیرہ) اور اصول محبت واخوت ومساوات کا اطلاق تمام سوشل تعلقات پر کرو (لوقا ۱۶: ۱۹۔؛ متی ۷: ۱۲وغیرہ) یوں ہماری انانیت اور شخصیت جبلّت اجتماع پسندی کے ذریعہ کامل ہوتی ہے۔ اور جبلّت اجتماع پسندی ہماری انانیت اور شخصیت کو دبا کر برباد کر دیتی ہے۔ کلمتہ اللہ کی یہ تعلیم ہے کہ جو شخص جماعتی تعلقات کا لحاظ رکھے بغیر اپنی انانیت اور شخصیت کو ترقی دینا چاہتا ہے۔ وہ ایک خام خیال میں مبتلا ہے۔ اور ایسا فرد اپنی شخصیت کو ترقی دینے کے بجائے اس کو ضائع کر دیتا ہے۔ لیکن جو شخص مسیحی اصول محبت ومساوات اور اخوت کے مطابق جماعتی تعلقات کے ذریعہ خلق خدا کی خدمت کرتا ہے۔ اور اس میں ایسا منہمک (کسی کام میں بہت مصروف) ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی شخصیت کو الٰہی منشا کے مطابق ترقی دیتا ہے۔ پس اس کی انانیت اور جماعتی تعلقات میں کوئی تصادم واقع نہیں ہوتا۔ منجی عالمین نے فرمایا ہے "میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک گیہوں کا دانہ زمین پر گر کے مر نہیں جاتا، وہ اکیلا رہتا ہے۔ لیکن جب مر جاتا ہے تو بہت سے پھل لاتا ہے۔ جو اپنی جان کو عزیز رکھتا ہے۔ وہ اسے کھو دیتا ہے۔ اور جو دنیا میں اپنی جان کو کھو دیتا ہے وہ اس کو ہمیشہ کی زندگی کے لئے محفوظ رکھے گا آدمی اگر ساری دنیا کو حاصل کر لے اور اپنی جان کا نقصان کرے تو اسے کیا فائدہ ہو گا" (یوحنا ۱۲: ۲۴؛ مرقس ۸: ۳۵وغیرہ)۔ پس مسیحی تعلیم کے مطابق انانیت اور جماعت دونوں ایک دوسرے کی مدد ومعاون ہیں۔ یہ دونوں چیزیں جو بظاہر متضاد معلوم ہوتی ہیں اور کسی دوسرے مذہب میں یکجا نہیں ہو سکتیں۔ مسیحی تعلیم میں باہم صلح کر کے پہلو بہ پہلو چلتی ہیں۔

(۲)

چونکہ قرآن اور اسلام افراد کو خود مختار۔ آزاد ذمہ وار ہستیاں تسلیم نہیں کرتے لہٰذا وہ اس تصور کا گرویدہ نہیں ہو سکتا۔ کہ فرد دیگر افراد کی خدمت کرنے میں ہی اپنی شخصیت کی ترقی اور نشوونما کر سکتا ہے۔ قرآن کے مطابق افراد کی زندگی کا اعلیٰ ترین نصب العین اور بہترین مطمع نظر خلق خدا کی خدمت کرنا نہیں ہے۔ لہٰذا وہ اخلاقیات کے اس پہلو کو چھوتا نہیں۔ اور اگر چھوتا بھی ہے تو اس پر زور نہیں دیتا۔ جس طرح انجیل دیتی ہے۔ لیکن دین فطرت کے لئے لازم ہے کہ وہ جبلّت اجتماع پسندی کے تقاضاؤں کو پورا کرے۔ چونکہ قرآن واسلام میں تقاضا کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ لہٰذا اسلام دینِ فطرت کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ مسیحیت کی تعلیم ہی دینِ فطرت کا جزو ہو سکتی ہے۔

جبلّت اجتماع پسندی اور نوع انسانی کی کاملیت

جو نصب العین کلمتہ اللہ نے ہماری نظروں کے سامنے رکھا ہے۔ وہ محض افراد کی نجات اور کاملیت کا ہی نہیں ہے۔ بلکہ سوسائٹی کی کاملیت اور نجات کا بھی ہے۔ ”خدا نے ہر ایک انسان کو مختلف نعمتیں اور قابلیتیں عطا کر کے اس دنیا میں بھیجا ہے“ (متی ۲۵: ۱۵)۔ اور اس دنیا کا نظام ایسا بنایا ہے کہ مختلف اشخاص کی مختلف نعمتوں کی تکمیل اور ترقی سے جماعت کی ترقی اور تکمیل ہوتی ہے۔ (۱۔ کرنتھیوں ۱۲ باب)۔ جس طرح ہمارے بدن میں بہت سے اعضا ہوتے ہیں۔ اور تمام اعضا کا کام یکساں نہیں اسی طرح ہم بھی بہت سے ہیں۔ مسیح میں شامل ہو کر ایک بدن اور آپس میں ایک دوسرے کے اعضا ہیں۔ اس توفیق کے موافق جو ہم کو دی گئی۔ ہمیں طرح طرح کی نعمتیں دی گئیں۔ تاکہ مقدس لوگ کامل بنیں۔ اور خدمت گزاری کا کام کیا جائے۔ اور مسیح کا بدن (یعنی جماعت) ترقی پائے۔ جب تک ہم سب کے سب خدا کے بیٹے کے ایمان اور اس کی پہچان میں ایک ہو جائیں اور کامل انسان بنیں یعنی مسیح کے پورے قد کے اندازے تک پہنچ جائیں۔ اور محبت کے ساتھ سچائی پر قائم رہے اور مسیح کے ساتھ پیوستہ ہو کر ہر طرح سے بڑھتے جائیں جس سے سارا بدن ہر ایک جوڑ کی مدد سے پیوستہ ہو کر اور گٹھ کر اس تاثیر کے موافق جو بقدر ہر حصے کے ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو بڑھاتا ہے تاکہ محبت میں ترقی کرتا جائے۔ (رومیوں ۱۲: ۴ ؛افسیوں ۴: ۱۳ وغیرہ)۔ کل بنی نوع انسان خدا کے خاندان کے افراد ہیں۔ اور ہر فرد اس خاندان کی خدمت کے ذریعہ اپنی شخصیت اور قابلیت کی نشوونما ہے۔ (مرقس ۹: ۳۵؛ ۱۔ یوحنا ۳: ۱۵)۔ ”یہ خاندان ان افراد کی کاملیت سے کامل ہوتا ہے اور بنی نوع انسان کا سارا بدن جوڑوں اور پٹھوں کے وسیلے سے پرورش پا کر اور باہم پیوستہ ہو کر خدا کی طرف سے بڑھتا ہے“ (کلسیوں ۲: ۱۹)۔

(۲)

اگر ناظرین نے گذشتہ فصلوں کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ تو ان پر یہ امر اظہر من الشمس (روز روشن کی طرح عیاں) ہو گیا ہو گا۔ کہ اسلام میں بنی نوع انسان کی ترقی ایک موہوم شے ہے۔ جس مذہب نے بنی نوع انسان کو تیرہ سو (۱۳۰۰) سال سے خوف و دہشت کی حالت میں رکھ کر ان کے اعضائے رئیسہ کو مضمحل کر دیا ہو۔ کثرت ازدواج اور طلاق کو جائز قرار دے کر نوع انسانی کے نصف حصہ کی زندگی کو ہراساں کر رکھا ہو۔ اور دوسرے حصہ کی اخلاقی حالت کو گرا دیا ہو۔ اولاد کے حقوق کی طرف سے لاپروائی اختیار کر رکھی ہو۔ دنیا کے مصیبت زدوں، مظلوموں اور بے کسوں کو ان کی قسمت پر چھوڑ رکھا ہو۔ دنیا کے قریباً چوبیس کروڑ افراد کو چھوڑ کر باقی ایک ارب اور ستر کروڑ افراد کو کافر یا ذمی کہہ کر ان کو گردن زدنی قرار دیتا ہو۔ خیالات کی آزادی جرم عظیم گردانتا ہو۔ اور علوم و فنون کی نشوونما اور ترقی کی راہ میں حائل ہو۔ غلامی کی قبیح رسم کو جائز قرار دیتا ہو۔ ہر فرد کی زندگی کی قدر اور وقعت کرنے کی بجائے اس کو ایک آزاد خود مختار اخلاقی ہستی بھی تسلیم نہ کرتا ہو۔ غرضیکہ جو مذہب انسانی فطرت کی تمام جبلّتوں کے اقتضاؤں کے پورا ہونے میں رکاوٹ کا باعث ہو“۔ ایسے مذہب سے کیا امید ہو سکتی ہے۔ کہ وہ بنی نوع انسان کی ترقی کے اصول کی تلقین کرے یا نوع انسان کو کاملیت کی شاہراہ پر گامزن ہونے میں ممد و معاون ہو سکے۔ مسیحیت ہی ایک ایسا واحد مذہب ہے جس سے نوع انسانی کی امیدیں وابستہ ہیں۔ کلمتہ اللہ ہی ایک ایسا یگانہ روزگار استاد ہے۔ جس پر بنی نوع انسان کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔

جبلّت اجتماع پسندی اور تصور ذات الٰہی

کلمتہ اللہ نے ہم کو یہ بھی تعلیم دی ہے کہ خدا محبت ہے۔ اور وہ گنہگار انسانوں کے ساتھ جو اس کے بیٹے ہیں رفاقت رکھنی چاہتا ہے۔ اور اس غرض کو حاصل کرنے کے لئے اس کی لازوال محبت گنہگار کی تلاش میں رہتی ہے۔ اور جب کسی گنہگار کا خدا کے ساتھ میل ملاپ ہو جاتا ہے۔ تو ننانوے (۹۹) راستبازوں کی نسبت جو توبہ کی حاجت نہیں رکھتے۔ ایک توبہ کرنے والے گنہگار کی بابت آسمان پر زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ (لوقا ۱۵ باب)۔ مذہب کا مقصد یہی ہے کہ خدا اور انسان میں باہمی رفاقت قائم ہو جائے۔ کلمتہ اللہ کی تعلیم انسان کے وجود کی علت غائی کو بدرجہ احسن پورا کرتی ہے۔ خدا ہمارا باپ ہے اور جس طرح دنیاوی باپ اپنے بیٹے کے ساتھ رفاقت رکھتا ہے۔ کلمتہ اللہ کی یہ تعلیم اسلام اور قرآن کے ان تمام تصورات کے خلاف ہے۔ جو خدا کو بے نیاز اور لاپرواہ بتلاتے ہیں۔ منجی عالمین نے فرمایا کہ خدا محبت ہے۔ اور وہ صرف گنہگاروں کی طرف سے بے نیازی ہی نہیں بلکہ ان کی جدائی اس پر شاق گذرتی ہے۔ اور وہ ان کے ساتھ رفاقت کا رشتہ از سر نو قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور اس مقصد کے حاصل کرنے میں اس کی محبت ہر طرح کا ایثار کرنے کے لئے تیار ہے (متی ۲۳: ۳۷؛ یوحنا ۳: ۱۶: ۱۵: ۱۳)۔ جس طرح ماں باپ کی محبت اپنے گم گشتہ فرزند کے لئے ہر طرح کی قربانی کرنے کو تیار ہوتی ہے۔ پس جبلّت اجتماع پسندی کے ذریعہ ہم خدا کی ذات اور اس کی محبت کا علم حاصل کر سکتے ہیں۔

(۲)

خدا کا تصور جو مسیحیت پیش کرتی ہے۔ وہ جبلّت اجتماع پسندی کے تقاضا کے مطابق ہے۔ خدا کی ذات محبت ہے (۱۔ یوحنا ۴: ۸ وغیرہ)۔ چونکہ خدا ازل سے محبت ہے۔ اور چونکہ اس کی ذات میں حدوث کا امکان نہیں۔ لہٰذا خدا کی ازلی محبت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ خدا کی ذات میں ازل سے محب، محبوب، اور محبت کا رشتہ موجود ہو۔ پس مسیحیت خدا کی وحدت میں ثالوث کی قائل ہے یعنی باپ، بیٹا اور روح القدس خدا کی ذات محب، محبوب اور محبت کے رشتہ کے طور پر ہیں (متی ۲۸: ۱۹؛ یوحنا ۱۲: ۱۵: ۲۶؛ ۲۶ وغیرہ)۔ باپ ازل سے بیٹے کے ساتھ محبت رکھتا ہے۔ اور بیٹا باپ کے ساتھ محبت رکھتا ہے (یوحنا ۱۷: ۵؛ ۱۷: ۲۴؛ ۵: ۲۰؛ متی ۱۱: ۲۷ وغیرہ)۔ پس ہم جبلّت اجتماع پسندی کے ذریعہ جو ہماری سرشت میں موجود ہے خدا کی ذات کا علم حاصل کر سکتے ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم تین خداؤں کے ماننے والے ہیں۔ ہم خدا واحد کے قائل ہیں (مرقس ۱۲: ۲۹؛ یوحنا ۱۷: ۳؛ ۱۔ کرنتھیوں ۸: ۶ وغیرہ)۔ ہم شرک سے متنفر اور بیزار ہیں (خروج ۲۰: ۳۔۵؛ ۱۔ کرنتھیوں ۸: ۴؛ اعمال ۱۴: ۱۵؛ ۱۔ یوحنا ۵: ۲۱؛ زبور ۱۱۵: ۴۔۸)۔ ہم ان تمام باتوں سے پرہیز کرتے ہیں جن سے شرک کی بو آتی ہے (رومیوں ۱۴: ۲۱۔ ۲۳؛ ۱۔ کرنتھیوں ۱۰: ۱۹۔ ۲۱؛ گلتیوں ۵: ۱۳۔ ۱۴ وغیرہ)۔ ہم خدا کو اکیلا اور واحد خدا تسلیم کرتے ہیں۔ ہم قرآن کے ہم نوا ہو کر کہتے ہیں کہ "بے شک وہ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ تین میں سے ایک ہے" (مائدہ 77)۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ "خدا کی نسبت حق بات بولو، اور تین نہ کہو، باز آؤ تمہارا بھلا ہو گا، اللہ جو ہے وہ تو ایک ہی معبود ہے" (نسا 169)۔ قرآن کہتا ہے، اللہ کی کوئی جورو نہیں۔ اس کا بیٹا کیونکر ہو گیا (انعام 101)۔ ہم بھی اس پر صاد کرتے (تصدیق کرنا) ہیں اور المسیح کی ابنیت کے تصور میں سے ہر طرح کے جسمانی اور دنیاوی عناصر کو

خارج کر کے سورہ اخلاص کی آیت کو نہایت اخلاص سے پڑھتے ہیں کہ ''اللہ نے نہ کسی کو جنا اور نہ وہ خود کسی سے جنا گیا اور اس کے جوڑ کا کوئی نہیں'' (اخلاص آیات 3و4)۔ اگر قرآن شریف کا ان آیات سے یہ مطلب تھا۔ کہ مسیحی عقیدہ پر اعتراض وارد کرے۔ تو اس نے مسیحی عقیدہ کے سمجھنے کی زحمت گوارا نہیں کی ''سبحانک ہذا بھتان عظیم'' دنیا کے کل مسیحی بغیر کسی استثنا کے ایسے عقیدہ کو مذموم و مطعون گرادنتے ہیں، کلیسیائے جامع خدا کی واحدانیت کی قائل ہے۔ تاریخ کلیسیا اس بات کی شاہد ہے کہ خدا کی توحید کے عقیدہ کو بحال اور مستحکم کرنے کی خاطر نقایاہ کی کونسل نے تثلیث فی التوحید اور توحید فی التثلیث کا عقیدہ وضع کیا تھا۔

ہم خدا کی ذات میں تین ہستیوں کے قائل نہیں۔ خدا ایک واحد ہستی ہے۔ ہم اس کی ہستی میں جمع اور تفریق کو جائز قرار نہیں دیتے۔ کہ کوئی کہے کہ ایک جمع ایک جمع ایک تین ہوئے۔ کیونکہ خدا کی ذات میں اجزا نہیں۔ خدا روح ہے اور اس کی ذات ان باتوں سے پاک اور منزہ ہے۔

لیکن جہاں انسان اپنی سرشت اور اپنی جبلّتوں کے میلان و تقاضا کے ذریعہ خدا کے اس تصور کا قیاس کر سکتا ہے۔ جو مسیحیت پیش کرتی ہے وہاں وہ اسلام کے اللہ کی ذات کا تصور کرنے سے قاصر ہے۔ اسلام خدا کی وحدت کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن جب انسان یہ پوچھتا ہے کہ اس وحدت کا مفہوم کیا ہے تو جواب ملتا ہے۔ کہ وحدت کا مطلب محض وحدت ہے۔ جب انسان اپنی جبلّت استفسار سے مجبور ہو کر یہ جاننا چاہتا ہے کہ وحدت محضہ کیا شے ہے۔ کیونکہ وہ اس قسم کی وحدت کو نہ تو عالم شہود میں اور نہ اپنی فطرت اور سرشت میں اور نہ اپنے روحانی تجربات میں پاتا ہے۔ تو قرآن اس کو اپنے رب اور اختیار سے خاموش کر دیتا ہے (حج 35، اخلاص ا)۔ اسلام ذات الٰہی کی نسبت سوالوں کا پوچھنا کفر قرار دیتا ہے۔ اسلام کے مطابق خدا ایک سلطان ہے۔ جو بذریعہ پیغمبر اور وحی اپنے شاہانہ احکام اپنی رعایا کو پہنچاتا ہے (بقر 101 وغیرہ)۔ قرآن بذریعہ جبرائیل لفظ بہ لفظ نازل کیا گیا ہے (زخرف 3، یونس 38 وغیرہ)۔ اس کی الہامی عبارت آسمانی الفاظ ہیں۔ جن میں انسانی عنصر کا رتی بھر دخل نہیں۔ اس کی وحی انسانوں کے روحانی تجربات اور ذہنی تفکرات سے بالکل مستغنی ہے۔ انسانی فکر غور اور خوض کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

لیکن مسیحیت کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا محض سلطان ہی نہیں۔ جو اپنی رعایا کو احکام پہنچائے پر ہی اکتفا کرے اور بس۔ بلکہ مسیحیت کے مطابق خدا ہمارا باپ ہے جس طرح دنیاوی باپ اپنے خیالات کو اپنے بیٹے پر ظاہر کرتا ہے۔ اور بیٹا اپنے تجربہ خیالات اور جذبات کے ذریعہ باپ کے تصورات، خیالات اور جذبات کو سمجھ سکتا ہے اور جان سکتا ہے۔ اور یوں باپ اور بیٹے میں باہمی رفاقت قائم رہتی ہے۔ اسی طرح خدا اور انسان میں باہمی قربت اور رفاقت قائم ہو جاتی ہے۔ بائبل شریف کی الہامی کتب ان تصورات جذبات اور تجربات کا مظہر ہیں۔ جو خدا اور انسان کی باہمی رفاقت و قربت کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں۔ مسیحیت کے مطابق خدا ایسی ہستی نہیں۔ جو انسان کے ساتھ حقیقی معنوں میں رفاقت نہ رکھے۔ اگر خدا انسان کے ساتھ رفاقت نہیں رکھتا۔ تو جہاں تک بنی نوع انسان کا تعلق ہے۔ اس کا وجود اور عدم وجود برابر ہے۔ انسانی محاورہ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ گفتگو اور رفاقت کے لئے کم از کم دو اشخاص کا ہونا لازمی امر ہے۔ اگر صرف ایک انسان ہی گفتگو کرتا جائے۔ تو وہ مخبوط الحواس (پاگل) قرار دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی دوسرا شخص اس سے بات چیت نہ کرے۔ تو ہم اس شخص کے قال پر گفتگو کا لفظ چسپاں نہیں کر سکتے۔ اور نہ دوسرے شخص کو پہلے کا رفیق یا ساتھی قرار دے سکتے ہیں۔ جس طرح ہم کسی دیوار پر کی مورت کے ساتھ گفتگو نہیں کر سکتے یا سنگتراش کے بت کے ساتھ رفاقت نہیں رکھ سکتے۔ اسی طرح ہم ایسے خدا کے ساتھ

قرابت اور رفاقت نہیں رکھ سکتے جو بے پرواہ ہو۔ اور جس کی صفت بے نیازی ہو قرآن بار بار اصرار کے ساتھ کہتا ہے کہ اللہ بے پرواہ ہے (بقر آیت ۲۷۰)۔ خدا جہان کے لوگوں کی طرف سے بے پرواہ ہے (آل عمران آیت ۹۷، یونس 69، نساء130، حج 63 وغیرہ)۔

خدا کے بے نیازی کا تصور انسان کی اس جبلّت پر زیر بحث کے عین نقیض ہے۔ اگر خدا بے نیاز ہے۔ تو انسان اور خدا میں باہمی رفاقت و قربت ناممکن ہے۔ اور اگر انسانی فطرت اس بات کی متقاضی ہے۔ کہ انسان اور خدا میں قربت اور رفاقت ہو تو خدا بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ پس اسلامی تعلیم اس بارے میں انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ لہٰذا اسلام دینِ فطرت نہیں ہو سکتا۔ برعکس اس کے مسیحیت اس بات پر اصرار کرتی ہے۔ کہ خدا محبت ہے اور خدا انسان کے ساتھ قربت اور رفاقت رکھنے کا خواہاں ہے۔ صرف یہی تعلیم انسان کی فطرت کے تقاضا کو پورا کرتی ہے۔ لہٰذا مسیحیت دینِ فطرت ہے۔

نتیجہ

سطور بالا میں ہم نے دیکھا کہ کلمتہ اللہ کی تعلیم ہر فرد و بشر کو ذمہ وار اخلاقی ہستی قرار دیتی ہے جس کی ترقی اور تکمیل سوشل تعلقات کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اور سوسائٹی کی ترقی اور بنی نوع انسان کی ترقی افراد کی کاملیت کے ذریعہ وقوع پذیر ہوتی ہے۔ مسیحیت نے ایسے اصول وضع کئے ہیں۔ جن کے اطلاق سے ہر زمانہ اور ملک کی قوم اور ملت اور جماعت کامل ہو سکتی ہے۔ منجی عالمین نے خدا کی ذات اور بنی نوع انسان کے باہمی تعلقات کی نسبت ایسی تعلیم دی ہے۔ جو جبلّت اجتماع پسندی کے ذریعہ ہم پر روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ پس جہاں تک اس جبلّت کا تعلق ہے مسیحیت ہی صرف دین فطرت ہو سکتا ہے۔

فصل ہشتم

جبلّت تحکم اور جبلّت عجز

جبلّت تحکم و عجز کی خصوصیات

تحکم کی جبلّت انسانی سرشت کے رجحانات اولیہ میں سے ہے۔ ہر انسان بالطبع خود نما ہوتا ہے۔ ہر شخص میں یہ قدرتی خواہش موجود ہے کہ وہ اپنی ذات کا اظہار کرے۔ دنیا میں جس شخص کو دیکھو گے۔ اس کی زبان پر لفظ "میں "اور اس کے جذبات اور افعال سے اس "میں "ہیکڑی (شیخی، سرکشی) ملے گی۔ نہ صرف تن آور زردار اور صاحب جاہ اشخاص میں خود نمائی اور تحکم (حکومت کرنا) ملتا ہے بلکہ کمزور، بزدل اور زبردست ہستیوں میں بھی تحکم پایا جاتا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ عالی نژاد ہستیاں تواضع اختیار کرتی ہیں۔ اور ان میں خود نمائی اس قدر نہیں پائی جاتی۔ جتنی فرومایہ لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ کیونکہ کمینہ فرومایہ بزدل اشخاص کا یہ رویہ ہے کہ وہ بزدل کے سامنے تحکم اور خود نمائی سے کام لیتے ہیں۔ پس جبلّت تحکم اور جبلّت عجز انسانی سرشت کا حصہ ہیں۔ جانوروں میں گھوڑا اور مور نہایت خود نما جانور ہیں۔ ان کے برعکس عجز واطاعت کی مثال وہ کتا ہے۔ جو مغلوب اور کمزور ہو لیکن جب وہ اپنی گلی میں ہوتا ہے تو وہ بھی شیر ہوتا ہے۔

اسی طرح بعض اشخاص جب اپنے آقاؤں کے سامنے حاضر ہوتے ہیں۔ تو ان کے عجز اور اطاعت کی حد نہیں ہوتی۔ ہر وقت الفاظ حضور، خداوند ان کے ورد زبان رہتے ہیں۔ لیکن جب یہی اصحاب گھر میں جاتے ہیں۔ تو بیوی بچوں پر حکمرانی کرتے اور ان کو مارتے پیٹتے ہیں۔ بعض اوقات وہی مالک جو اپنے دفتر میں اپنے ماتحتوں پر شیر ہوتے ہیں۔ جب گھر میں جاتے ہیں تو بیوی کے ڈر کے مارے کونے میں دبک کر پڑے رہتے ہیں۔

(۲)

یہ دونوں جبلّتیں خصوصاً اس موقعہ پر تحریک میں آتی ہیں۔ جب دیکھنے والے موجود ہوں۔ جن کی موجودگی کی وجہ سے ہم کو اپنی ذات کسی طریقہ سے بہتر یا کہتر نظر آتی ہے۔ تحکم اور خود نمائی کی جبلّت کے ساتھ عجب یا غرور فخر اور موقع کے جذبات وابستہ ہوتے ہیں۔ ان دونوں جبلّتوں کی تحت میں تصنع، دکھاوا، لاف و گزاف (شیخی، بے ہودہ گفتگو)، خود پسندی یا خجالت شرم اور خفت وغیرہ کے میلانات داخل ہیں۔ جو کم سن بچوں سے لے کر سن رسیدہ (عمر رسیدہ، بوڑھے) اشخاص تک سب میں پائے جاتے ہیں۔ نہ جبلّت تحکم چاہتی ہے کہ دنیا میری محکوم ہو جائے اور اس کی خواہش روز افزوں ہو جاتی ہے۔

جبلّت تحکم و عجز اور دینِ فطرت کے لوازمات

سطور بالا سے ظاہر ہے کہ دینِ فطرت کا یہ کام ہے کہ تحکم اور خود نمائی کے جذبہ کو حد سے زیادہ بڑھنے نہ دے، تا کہ غرور ناجائز، فخر، لاف و گزاف، تصنع، دکھاوا اور خود پسندی کا قلع قمع (خاتمہ) ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہی عجز و اطاعت کی جبلّت یہاں تک تجاوز نہ کر جائے۔ کہ پست ہمتی، تذلل، اور شکست خوری انسان کے امتیازی نشان ہو جائیں۔ دونوں جبلّتیں باہم دوش بدوش ہو کر چلیں۔ تا کہ انسانی تعلقات میں دونوں جبلّتیں اس مقصد کا اظہار ہوں جس کی وجہ سے خدا نے یہ جبلّتیں ہماری فطرت میں ودیعت فرمائی ہیں۔

دینِ فطرت کو یہ تعلیم دینی چاہیے کہ انسان اپنی ذات کے اظہار اور انانیت کی ترقی اور تکمیل میں اس بات کا خاص لحاظ رکھے۔ کہ یہ ترقی اور تکمیل دوسرے لوگوں کی انانیت کو پامال کرنے سے نہ ہو اس تکمیل پر خلق خدا کے حقوق کو قربان نہ کیا جائے۔ اور دوسرے لوگوں کی انانیت کو دبایا اور پاؤں تلے روا ندنہ جائے۔ بلکہ اس کے برعکس ہر انسان اپنی اپنی انانیت کی ترقی علم اور عاجزی کے ساتھ خلق خدا کی خدمت کے ذریعہ کرے۔ اگر کوئی شخص اپنی ذات کا اظہار کرنا چاہتا ہے تو وہ بنی نوع انسان کی فلاح بہبودی اور خدمت کے ذریعہ کرے۔ اور خلق خدا کی خدمت میں ادنیٰ ترین کام کرنا اپنا فرض اولین خیال کرے۔ یہاں تک کہ دوسروں کی خاطر خوشی سے اپنے جائز حقوق سے بھی دستبردار ہو جائے۔ اور اپنی جا و بیجا اغراض کی ہوس کو پورا کرنا ہی اپنی زندگی کا واحد مقصد خیال نہ کرے۔ بلکہ اپنے ہم جنسوں کی خاطر اپنی خودی سے انکار کر کے اپنی ذات کا اظہار بنی نوع انسان کی بہبودی کو سرانجام دینے کے ذریعہ کرے۔

ایک اور امر قابل غور ہے کہ اگر انسان اس جبلّت خداداد کے ذریعہ اپنی انانیت کو درست طریقہ سے ترقی دے گا۔ تو اس میں ہیکڑی نہیں آئے گی۔ بلکہ اس کے برعکس اس میں حلم اور فروتنی اور خدا کی شکر گزاری کے جذبے بڑھیں گے۔ مثلاً کسی زلزلہ یا ریل کے حادثہ کے وقت بعض انسان طبعاً جائے وقوع کی طرف امداد کرنے کی خاطر بھاگتے ہیں اور اس امداد کے ذریعہ اپنی ذات کا اظہار اور اپنی انانیت کی ترقی اور تکمیل کرتے ہیں۔ لیکن ایسے اشخاص لوگوں پر اپنے کارنامے نہیں جتائیں گے۔ بلکہ اس طریقہ سے اپنی ذات کے اظہار کرنے میں فخر اور لاف و گزاف سے باز رہیں گے۔ اور فروتنی سے خدا کا شکر کریں گے کہ وہ اس لائق خیال کئے گئے کہ اپنے ہم جنسوں کی مصیبت کے وقت وہ ان کی خدمت کر سکیں۔

عجز و تحکم کی جبلّت اور مسیحیت

کلمتہ اللہ نے یہ تعلیم دی ہے کہ "جو کوئی اپنے آپ کو بڑا بنائے گا وہ چھوٹا کیا جائے گا۔ اور جو اپنے آپ کو چھوٹا بنائے گا وہ بڑا کیا جائے گا" (متی ۲۳: ۱۲)۔ ایک دفعہ جب آپ کے شاگردوں میں یہ تکرار ہوئی۔ کہ ہم میں سے بڑا کون ہے۔ تو منجی عالمین نے عظمت اور بڑائی کا معیار بنی نوع انسان کی خدمت قرار دیا۔ اور فرمایا۔ "اقوام کے بادشاہ ان پر حکومت چلاتے ہیں۔ اور جو ان پر اختیار رکھتے ہیں۔ وہ خداوندانِ نعمت کہلاتے ہیں۔ مگر تم ایسے نہ ہونا۔ بلکہ جو تم میں بڑا ہے۔ وہ چھوٹے کی مانند اور جو سردار ہے۔ وہ خدمت کرنے والے کی مانند بنے۔ میں تمہارے درمیان خدمت کرنے والے کی

مانند ہوں"(لوقا ۲۲: ۲۵)۔ انجیل میں حضرت پولُس فرماتے ہیں کہ "میں اس توفیق کی وجہ سے جو مجھ کو ملی ہے۔ تم میں ہر ایک سے کہتا ہوں کہ جیسا سمجھنا چاہیے۔ اس سے زیادہ کوئی اپنے آپ کو نہ سمجھے بلکہ جیسا خدا نے ہر ایک کو اندازے کے موافق ایمان تقسیم کیا ہے۔ اعتدال کے ساتھ اپنے آپ کو ویسا ہی سمجھے"(رومیوں ۱۲: ۳؛ ۲۔ کرنتھیوں ۱۰: ۱۳ وغیرہ)۔ جناب مسیح نے فرمایا۔ "مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب اور حلیم ہیں"(متی ۵: ۴)۔ انجیل میں وارد ہے۔ کہ ہم "بے جا فخر کر کے نہ ایک دوسرے کو چڑائیں، اور نہ ایک دوسرے سے جلیں"(گلتیوں ۵: ۲۶)۔ مسیح کے خوف سے ایک دوسرے کے تابع رہو"(افسیوں ۵: ۲۱)۔ "بے جا فخر کے باعث کچھ نہ کرو۔ بلکہ فروتنی سے ایک دوسرے کو اپنے سے بہتر سمجھے۔ ہر ایک اپنی ہی احوال پر نہیں۔ بلکہ ہر ایک دوسروں کے احوال پر بھی نظر رکھے۔ ویسا ہی مزاج رکھو۔ جیسا سیدنا مسیح کا تھا۔ انہوں نے اگرچہ خدا کی صورت پر تھے۔ اپنے آپ کو خالی کر دیا۔ اور خادم کی صورت اختیار کی۔ اور آپ انسانی شکل میں ظاہر ہوئے اور اپنے آپ کو پست کر دیا۔ اور یہاں تک فرمانبردار ہے کہ موت بلکہ صلیبی موت گوارا کی۔ اسی واسطے خدا نے بھی انہیں سربلند کیا۔ اور آپ کو وہ نام بخشا۔ جو سب ناموں سے اعلیٰ ہے۔(فلپیوں ۲: ۳)۔ "ایک دوسرے کی خدمت کے لئے فروتنی سے کمربستہ رہو۔ اس لئے کہ خدا مغروروں کا مقابلہ کرتا ہے۔ مگر فروتنوں کو توفیق بخشتا ہے۔ پس خدا کے قوی ہاتھ کے نیچے فروتنی سے رہو تا کہ وہ تم کو وقت پر سربلند کرے"(۱۔ پطرس ۵: ۶؛ ۲۔ کرنتھیوں وغیرہ)۔

(۲)

منجی عالمین کی پیدائش، واقعات، زندگی اور موت سب کے سب علم اور فروتنی کا اظہار ہیں۔ ایک دفعہ جب شاگرد اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ ان میں بڑا کون ہے تو آپ نے "اٹھ کر کپڑے اتارے اور رومال لے کر اپنی کمر پر باندھا۔ اس کے بعد برتن میں پانی ڈال کر شاگردوں کے پاؤں دھوئے اور جو رومال کمر میں بندھا تھا۔ اس سے پونچھنے شروع کئے۔۔۔۔ جب آپ ان کے پاؤں دھو چکے۔ اور اپنے کپڑے پہن کر پھر بیٹھ گئے تو ان سے کہا کیا تم جانتے ہو کہ میں نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟ تم مجھے استاد اور مولا کہتے ہو، اور خوب کہتے ہو، کیونکہ میں ہوں، پس جب میں نے استاد اور مولا ہو کر تمہارے پاؤں دھوئے، تو تم پر بھی فرض ہے کہ ایک دوسرے کے پاؤں دھویا کرو۔ کیونکہ میں نے تم کو ایک نمونہ دکھایا ہے۔ کہ جیسا میں نے تمہارے ساتھ کیا ہے۔ تم بھی کیا کرو(یوحنا ۱۳ باب)۔

(3)

انجیل جلیل کی تعلیم کی بنیاد یہ ہے کہ چونکہ جناب مسیح اپنی لازوال محبت کی وجہ سے فروتن ہو کر انسانی شکل میں آئے(فلپیوں ۲: ۶۔۹ وغیرہ)۔ تا کہ ایثار کے ذریعہ بنی نوع انسان کا اپنے ساتھ میل ملاپ کریں(۲۔ کرنتھیوں ۵: ۱۸ وغیرہ) لہٰذا کوئی انسان اپنے اعمال پر نازل ہو کر ازراہ تحکم خدا کے سامنے کھڑا نہیں ہو سکتا(زبور ۱۳۰: ۳)۔ بعض انسانوں کا یہ قاعدہ ہے کہ جب وہ دوسروں کے ساتھ نیکی اور احسان کرتے ہیں۔ یا نماز، زکواۃ، روزہ ، خیرات، وغیرہ کے پابند ہوتے ہیں۔ تو وہ اپنے اعمال پر فخر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان میں بے جا غرور اور ترفع کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور دوسروں کو جو شرعی امور کے پابند نہیں ہوتے۔ بنظر حقارت دیکھتے ہیں۔ اس قسم کا غرور ہماری روحوں کو برباد کر دیتا ہے۔ کلمتہ اللہ نے ایسی باتوں کے

خلاف تمام عمر جہاد کیا اور اپنے سامعین کو بار بار اس کے خلاف متنبہ کیا (متی ۶: ۵؛ ۶: ۱۶؛ ۷: ۱۔۵؛ لوقا ۱۲: ۱ وغیرہ)۔ آپ کے رسول نے بھی ان باتوں کے خلاف لوگوں کو خبر دار کیا۔ اور فرمایا "کہ جو فخر کرے خداوند پر فخر کرے (۲۔کرنتھیوں ۱۰: ۱۷)۔ کلمتہ اللہ نے ان لوگوں کو جو اپنے پر بھروسا رکھتے تھے کہ ہم متقی اور پرہیز گار ہیں۔ اور باقی آدمیوں کو ناچیز جانتے ہیں۔ یہ تمثیل فرمائی "دو شخص بیت اللہ میں دعا مانگنے گئے۔ ایک فریسی اور دوسرا محصول لینے والا۔ فریسی کھڑا ہو کر اپنے جی میں یوں کہنے لگا کہ اے پروردگار میں تیرا شکر کرتا ہوں کہ باقی آدمیوں کی طرح ظالم بے انصاف زناکار یا محصول لینے والے کی طرح نہیں ہوں۔ میں ہفتے میں دوبار روزہ رکھتا ہوں۔ اور اپنی ساری آمدنی پر دسواں حصہ لگاتا ہوں۔ لیکن محصول لینے والے نے دور کھڑے ہو کر اتنا بھی نہ چاہا۔ کہ آسمان کی طرف نظر اٹھائے۔ بلکہ چھاتی پیٹ پیٹ کر کہا اے خدا مجھ گنہگار پر رحم کر۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ یہ شخص دوسرے کی نسبت متقی اور پرہیز گار ٹھہر کر اپنے گھر گیا" (لوقا ۱۸: ۹)۔ ہم اپنے اعمال کے سبب متقی اور پرہیز گار نہیں ہوسکتے۔ یہ محض خدا کا فضل اور کرم ہے۔ اور اس کی لازوال ابدی محبت کا نتیجہ ہے کہ ہم گناہ کی غلامی سے نجات پا گئے ہیں۔ لہٰذا خدا کے حضور بے جا فخر کی گنجائش ہی نہیں (افسیوں ۲: ۸۔۹؛ ۱: ۹؛ ۳: ۵؛ رومیوں ۳: ۲۰؛ ۳: ۲۸ وغیرہ)۔

(4)

پس مسیحیت تحکم اور خود نمائی کو حد سے بڑھنے نہیں دیتی۔ اور ہر طرح کے ناجائز فخر اور غرور، لاف و گزاف کا استیصال (جڑ سے اکھاڑنا) کرتی ہے۔ جہاں وہ یہ تعلیم دیتی ہے کہ انسان خلق خدا کی خدمت کے ذریعہ اپنی انانیت کو ترقی اور تکمیل دے۔ وہاں وہ عجز اور اطاعت کی جبلّت کو حد سے تجاوز نہیں کرنے دیتی۔ بلکہ اس معاملہ میں اعتدال کی تلقین کرتی ہے۔ اور افراط اور تفریط سے ہم کو بچاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسیحیت میں تحکم اور اطاعت کی دونوں جبلّتیں بغیر کسی تصادم کے ہمدوش چل کر ہماری انانیت کا الٰہی منشا کے مطابق اظہار کرتی ہیں۔ اور ثابت کر دیتی ہیں کہ مسیحیت دین فطرت ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

جبلّت تحکم و عجز اور اسلام کی تعلیم

یہ حقیقت ایک مسلمہ امر ہے کہ جن اوصاف سے کسی قوم کا معبود و متصف (تعریف کیا گیا) ہوتا ہے۔ اس قوم کے افراد کا مطمع نظر (مقصد اصلی) اور نصب العین یہی ہوتا ہے کہ ان معبود کے اوصاف ان کے اندر موجود ہوں۔ مثلاً اگر کسی قوم کا دیوتا خونخوار صفات سے متصف ہے تو وہ قوم بھی خونخوار ہی ہوگی۔ اور اس میں حلم اور رحم اور محبت عنقا (نایاب چیز) ہوں گے۔ ہم نے فصل دوم میں دیکھا ہے کہ قرآن میں اللہ تمام اسمائے جلالی سے متصف ہے اور اپنی صفات پر زیادہ زور بھی دیا گیا ہے۔ مثلاً قرآنی اللہ قدیر، قوی، مقتدر، قادر، غالب، مزیل، قہار، جبار وغیرہ ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ان صفات کا تعلق تحکم اور خود نمائی کے ساتھ ہے۔ چونکہ اللہ ان صفات سے متصف ہے۔ جن کا تعلق تحکم اور خود نمائی کے ساتھ ہے۔ لہٰذا ہر مومن مسلمان کا (زیر حکم تخلقو ابا اخلاق اللہ۔ یعنی اپنے اندر اللہ کی صفات پیدا کرو)۔ یہ نصب العین ہے کہ اپنے اندر تحکم اور خود نمائی پیدا کرے۔ پس قرآن انجیل کی طرح اس بات پر زور نہیں دیتا کہ انسان حلم، فروتنی اور صبر کے ساتھ خلق خدا کی خدمت کے ذریعہ اپنی انانیت کا اظہار کرے۔ بلکہ

اس کے برعکس وہ تحکم پر حد سے زیادہ بلکہ بے اندازہ زور دیتا ہے۔ چنانچہ قرآنی حکم ہے کہ "جنگ کفار کے لئے جس قدر تم سے ہو سکے قوت۔۔۔ سے تم اپنے اور خدا کے دشمنوں کو ڈراؤ۔ اور ان کے سوا اور لوگوں کو بھی ڈراؤ (انفال ۶۲)۔ مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو۔ گھیرو۔ اور ہر گھاٹ کی جگہ میں ان کے لئے بیٹھو (توبہ آیت 5)۔ محمد کے ساتھی کافروں پر سخت ہیں (فتح آیت ۲۹)۔ آپس میں جھگڑا نہ کرو۔ ورنہ تم بزدل بن جاؤ گے اور تمہاری ہوا جاتی رہے گی (انفال 48)۔ اگرچہ قرآن اس امر کی تسلیم کرتا ہے کہ عیسائی مسلمانوں کے دوست ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ دوستی کے بارے میں مسلمانوں کے حق میں تو ان کو زیادہ قریب پائے گا۔ جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں یہ اس لئے کہ ان میں عالم اور درویش ہیں۔ اور یہ لوگ تکبر نہیں کرتے (مائدہ 85)۔ تاہم قرآن مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ تم عیسائیوں کو نہ صرف دوست نہ بناؤ (مائدہ 56)۔ بلکہ ان سے مقابلہ کرو۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں اور ذلیل ہو کر رہیں (توبہ آیت ۲۹)۔ قرآن کی تعلیم ہے کہ مسلمان اپنے لوگوں کو ہی سلام کریں۔ اور غیر مسلموں کو سلام کرنے میں پہل نہ کریں (نور 61)۔ لیکن اگر وہ سلام کریں۔ تو ان کے سلام کا جواب دیں (نساء 88)۔ مسلمان مرد، عورتوں، پر حاکم ہیں (نسا 39) غرضیکہ قرآنی تعلیم بے جا غرور اور فخر اور جھوٹی عزت اور شان کی حمایت کرتی ہے۔ لیکن انجیل جلیل کی تعلیم اس قسم کے جذبات کے منافی ہے (متی ۵: ۴۳۔۴۸؛ کلسیوں ۳: ۱۲۔۱۳؛ فلپیوں ۲: ۳۔۵؛ افسیوں ۴: ۳۱؛ ۴: ۱۔۴ وغیرہ)۔

(۲)

دینِ فطرت کا یہ کام تھا کہ تحکم اور خود نمائی کے جذبہ کو ایک مقررہ اور معین حد سے تجاوز نہ ہونے دے۔ اور ناجائز فخر کا قلع قمع کرے۔ اسلام اور قرآن کی تعلیم یہ نہیں کرتی۔ اس میں یہ بات ہی نہیں کہ انسان اپنی ذات کا اظہار اور اپنی انانیت کی ترقی صرف خلق خدا کی علم اور عاجزی کے ساتھ خدمت کرنے میں ہی کر سکتا ہے۔ قرآن اس بات کی برداشت ہی نہیں کر سکتا کہ کوئی مسلمان غیر مسلموں کی خاطر اپنے جائز حقوق سے دست برداری اختیار کرے یا اپنی خودی کا انکار کرے۔ اس کے برعکس کفار کو قتل کرنا، ہر شخص کو اپنا مطیع کرنا بلکہ عیسائیوں تک جو اسلام کے دوست ہیں۔ ذلیل اور خوار کرنا یہ اسلام کی خصوصی تعلیم ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال جیسا شخص بھی "اسرار خودی" میں کہتا ہے کہ

> "ایثار نفسی اور خود انکاری دنیا کی محکوم اقوام کا مذہب ہے۔ اور ان کے ہاتھ میں یہ آلات حاکم قوم کو اپنے اثر سے کمزور کر دیتے ہیں۔ روحانی خوف ان کی طاقت کو کمزور کر دیتا ہے۔ اور جوں جوں ایثار نفسی بڑھتی ہے۔ حکام کی جسمانی قوت میں فرق آتا جاتا ہے"۔

علامہ موسوف اہل اسلام کو خبردار کرتا ہے۔ کہ ایسے مذہب کے نزدیک نہ پھٹکیں۔ لیکن یہ تعلیم جیسا ہم اوپر ثابت کر آئے ہیں۔ ہماری شرست کی جبلّت زیر بحث کے قطعاً خلاف ہے۔ لہٰذا جہاں تک اس جبلّت کا تعلق ہے۔ اسلام کے دینِ فطرت ہونے کی اپنے اندر صلاحیت نہیں رکھتا۔

تحکم کی جبلّت اور محمد عربی یا مسیح ناصری

قرآن اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ وہ اللہ کی سطوت (قہر، رُعب، شان وشوکت) اور جبروت (عظمت) کے منوانے پر نہایت غلو اور مبالغہ سے کام لیتا ہے (آل عمران 126، 29، نساء 62، مائدہ 93 وغیرہ)۔ قرآن نہ صرف رسول عربی کی اطاعت کا حکم دیتا ہے، بلکہ اس اطاعت کی تفصیل بھی کرتا ہے تاکہ آپ کی دینوی عزت ووقار بڑھے۔ مثلاً قرآن مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ "مومنو جب تم رسول کے کان میں بات کہنا چاہو تو کان میں بات کرنے سے پہلے کچھ خیرات آگے رکھ لیا کرو۔ یہ تمہارے حق میں بہتر اور زیادہ صفائی کا موجب ہے" (مجادلہ آیت 13)۔ "تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اور اللہ کے رسول کو قوت دو۔ اور اس کی تعظیم کرو" (فتح 9)۔ "اللہ کے رسول کے آگے نہ بڑھو اور اللہ سے ڈرو۔ نبی کی آواز پر اپنی آوازیں بلند نہ کیا کرو۔ اور اس کے ساتھ زور زور سے بات نہ کرو ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال اکارت جائیں۔ جو لوگ رسول کے سامنے اپنی آوازیں پست کرتے ہیں وہی ہیں۔ جن کے دل اللہ نے تقویٰ کے لئے آزمائے ہیں۔ ان کے لئے مغفرت اور عظیم اجر ہے۔ جو لوگ گھر کی چار دیواری کے باہر تجھ کو پکار کر بلاتے ہیں۔ وہ اکثر بے عقل ہیں۔ ان کو چاہیے کہ وہ صبر کریں۔ یہاں تک کہ تو باہر نکلے۔ یہ ان کے لئے بہتر ہوتا" (حجرات 1تا4)۔ "مومن وہی ہیں۔ جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں۔ اور جب اس کے ساتھ کسی جمع ہونے کا کام میں ہوں۔ تو اس سے اجازت حاصل کئے بغیر نہ چلے جایا کریں۔ جو لوگ تجھ سے اجازت حاصل کر کے جاتے ہیں۔ وہی ہیں جو اللہ اور رسول پر ایمان لاتے ہیں۔ جب وہ اپنے کسی کام کے لئے تجھ سے جانے کی اجازت مانگیں۔ تو ان میں سے جس کو چاہے تو اجازت دے۔ اللہ ان کو جانتا ہے۔ جو تم میں سے نظر بچا کر کھسک جاتے ہیں۔ سو جو لوگ اس کے حکم کی خالفت کرتے ہیں۔ چاہیے کہ ڈریں کہ ان پر کوئی آفت نہ آجائے۔ یا ان کو دکھ دینے والا عذاب پہنچے" (نور آیت 62و63)۔ "اپنے درمیان رسول کا بلانا ایسا نہ ٹھہراؤ۔ جیسے تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہیں" (نور 63)۔ اے محمد جب تک یہ لوگ اپنے جھگڑوں میں تجھ کو منصف نہ بنائیں۔ یہ مسلمان ہو نہیں سکتے۔ پھر جو فیصلہ دے۔ اس پر اپنے دلوں میں تنگ نہ ہوں۔ بلکہ تابعدار بن کر تسلیم کریں" (نساء 68)۔ "ایمان والوں کو لازم ہے کہ جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائیں جائیں۔ تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے۔ تو کہیں کہ ہم نے سنا اور حکم مانا" (نور 50)۔ "جب اللہ اور اس کا رسول کوئی بات مقرر کرے۔ تو کسی ایماندار مرد اور عورت کا کام نہیں کہ ان کو اپنے کام کا اختیار ہے" (احزاب 36)۔

مندرجہ بالا آیات کا مقصد یہ نہ تھا کہ عرب کی وحشی غیر مہذب قوم کو آداب مجلس سکھلائے جائیں۔ کیونکہ ان کا تعلق رسول کی ذات خاص سے ہے۔ اور زمانہ جاہلیت کے عرب آدابِ مجلس سے ناواقف نہ تھے۔ ان آیات سے رسول کے وقار وافتخار کا استحکام اور آپ کی عظمت وشان کی استواری کے سوا اور کوئی مقصد نہ تھا۔

(۲)

اس کے برعکس اگر ہم ابن اللہ کی زندگی پر سطحی نظر ڈالیں۔ تو ہم کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ گو آپ علم اور فروتنی کا نمونہ تھے (متی ۱۱: ۱۹)۔ تاہم آپ کے حلم اور فروتنی کا یہ مطلب نہ تھا کہ آپ پست ہمت تھے یا اپنی ذات اور خودداری کا اظہار نہیں کرتے تھے۔

انجیل اس پر گواہ ہے کہ جہاں سچائی اور حق گوئی، فرض شناسی یا ضمیر وغیرہ کا تعلق ہے وہاں آپ نے بے مثال دلیری کے ساتھ اپنی شخصیت اور اختیار کا مظاہرہ کیا۔ مثلاً آپ نے تمام جہان کی مخالفت کو سہیڑ لیا۔ لیکن گنہگاروں کو نجات کی خوشخبری دینے سے آپ دستبردار نہ ہوئے۔ تمام فریسی آپ کے دشمن جان ہو گئے۔ لیکن آپ نے ان کی بے قیود اور غلط اصول کو طشت ازبام (مشہور اور عام ہونا) کر دیا۔ آپ کی صلیب اس امر کی گواہ ہے کہ دنیا کی طاقت آپ کو مصلوب تو کر سکی لیکن آپ کو مغلوب نہ کر سکی۔ آپ محسوس کرتے تھے کہ "آسمان اور زمین کا کل اختیار مجھے دیا گیا ہے" (متی ۲۸: ۱۸)۔ "میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا ہے" (متی ۱۱: ۲۷)۔ آپ ہر طرح سے "صاحب اختیار" تھے (یوحنا ۳: ۳۵؛ ۱۳: ۳؛ ۱۷: ۲؛ اعمال ۲: ۳۶؛ رومیوں ۱۴: ۹؛ ۱۔ کرنتھیوں ۱۵: ۲۷؛ افسیوں ۱: ۱۰؛ ۱: ۲۰۔ ۲۲؛ فلپیوں ۲: ۶۔ ۱۰؛ کلسیوں ۲: ۱۰؛ عبرانیوں ۱: ۲؛ ۲: ۸؛ ۱۔ پطرس ۲: ۲۲؛ مکاشفہ ۱۷: ۱۴ وغیرہ)۔ آپ نے ایسے دعوے کئے۔ جو انسان نے کبھی نہ کئے۔ یہاں تک کہ آپ نے فرمایا کہ آپ روز حشر دنیا کا انصاف کریں گے (متی ۱۶: ۲۷؛ ۲۵: ۳۱ وغیرہ)۔ آپ جب دنیا میں تھے۔ تو اس اختیار کے باعث "صاحب اختیار" کی طرح تعلیم دیتے تھے۔ (متی ۷: ۲۹؛ مرقس ۱: ۲۲ وغیرہ)۔ آپ کی گفتار و رفتار معجزات۔ غرضیکہ ایک ایک ادا سے آپ کا اختیار ٹپکتا تھا (متی ۸: ۹؛ مرقس ۱: ۲۷؛ لوقا ۹: ۱؛ یوحنا ۵: ۲۷ وغیرہ)۔ یہ بات آپ کے دشمن بھی مانتے تھے (متی ۲۱: ۲۳؛ مرقس ۱۱: ۲۸؛ یوحنا ۷: ۴۶ وغیرہ)۔ لیکن آپ باوجود صاحب اختیار ہونے کے پرلے درجے کے فروتن اور حلیم تھے (متی ۱۱: ۲۹) آپ نے اپنی ذات کا اظہار خلق کی خدمت کے ذریعہ کیا۔ اور فرمایا "ابن آدم اس لئے نہیں آیا کہ خدمت لے بلکہ خدمت کرے" (متی ۲۰: ۲۸)۔ چنانچہ آپ کو یہ احساس تھا کہ "باپ نے سب چیزیں میرے ہاتھ میں کر دیں ہیں۔ اور میں خدا کے پاس سے آیا۔ اور خدا ہی کے پاس جاتا ہوں" (یوحنا ۱۳: ۳)۔ لیکن آپ نے اس اختیار کا اظہار "دنیا کی ساری بادشاہتوں اور ان کی شان و شوکت" کو حاصل کر کے نہ کیا (متی ۴ باب)۔ بلکہ اس اختیار کے احساس کا اظہار یوں کیا۔ کہ "آپ نے دستر خوان سے اٹھ کر کپڑے اتارے۔ اور رومال لے کر اپنی کمر میں باندھا تھا۔ اس سے پونچھنے شروع کئے۔ جب آپ ان کے پاؤں دھو چکے تو ان سے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ میں نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟ تم مجھے استاد اور مولا کہتے ہو اور خوب کہتے ہوں کیونکہ میں ہوں پس جب مجھ استاد اور مولا نے تمہارے پاؤں دھوئے۔ تو تم پر بھی فرض ہے کہ ایک دوسرے کے پاؤں دھویا کرو۔ کیونکہ میں نے تم کو ایک نمونہ دکھایا ہے۔ کہ جیسا میں نے تمہارے ساتھ کیا ہے تم بھی کیا کرو" (یوحنا ۱۳: ۴)۔ آپ کی ذات نے ان دونوں جبلّتوں تحکم اور جبلّت عجز دونوں اپنی کمالیت میں جمع تھیں۔ اور آپ نے ان دونوں جبلّتوں کے ذریعہ اس محبت کا اظہار فرمایا۔ جو آپ کے دل میں بنی نوع انسان کے لئے موجزن تھی۔ ''حسنت جمیع خصالہ'' صرف آپ کی ذات پاک پر ہر پہلو سے صادق آسکتا ہے۔

(3)

ابن اللہ نے اپنے نمونہ سے ہم کو سکھلایا ہے کہ ہم کو دوسروں کی خاطر اپنے حقوق سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔ انجیل شریف بہ مطابق (متی ۱۱: ۲۹) میں جس یونانی لفظ کا ترجمہ "حلیم" ہوا ہے۔ اس کے معنی "حقوق سے دستبردار" ہو جانا ہے۔ اور یہی بات (فلپیوں ۲: ۴) میں صریحاً وارد ہوئی ہے۔ جناب مسیح کی زندگی ایسے بے شمار واقعات رونما ہوئے جب آپ اپنے جائز حقوق سے "دست بردار" ہوئے (متی ۳: ۱۳۔۱۷؛ ۱۷: ۲۴۔۲۷ وغیرہ)۔ انجیل نے ہم کو تعلیم دی ہی کہ دوسروں کی خاطر ہم کو بخوشی خاطر اپنے جائز حقوق سے دست بردار ہو جانا چاہیے (رومیوں ۱۲: ۲۱؛ گلتیوں ۵: ۱۳؛ ا۔ کرنتھیوں ۸: ۹؛ ۱۰: ۲۳ وغیرہ)۔ دوسرے لوگوں کی محبت کی خاطر کلمتہ اللہ ہر طرح کا ایثار اور قربانی کرنے کو تیار تھے۔ آپ کے نمونے اور آپ کی انجیل نے حلیمی اور محبت کا باہمی رشتہ دکھلایا۔ "محبت شیخی نہیں مارتی۔ اور پھولتی نہیں۔ اپنی بہتری نہیں چاہتی" (ا۔ کرنتھیوں ۱۳: ۴)۔ محبت کے ساتھ دوسروں کی خدمت علم اور فروتنی سے کرنا اور اس قسم کی خدمت سرانجام دینے میں اپنی عین سعادت سمجھنا۔ یہ دونوں باتیں زیر بحث جبلّتوں کے تقاضاؤں کو احسن طور پر پورا کرتی ہیں۔ ابن اللہ نے دوسروں کی محبت کی خاطر اپنی خودی سے انکار کرنے پر اور ہر قسم کا ایثار کرنے پر زور دیا ہے۔ آپ نے فرمایا" اگر کوئی میرے پیچھے آنا چاہے تو اپنی خودی سے انکار کرے۔ اور اپنی صلیب اٹھائے اور میرے پیچھے ہو لے۔ کیونکہ جو کوئی اپنی جان بچانی چاہے وہ اسے کھوئے گا۔ اور جو کوئی میرے واسطے اپنی جان کھوئے گا۔ وہ اسے پائے گا" (متی ۱۶: ۲۴)۔ فروتنی درحقیقت خود فراموشی ہے۔ ہم اپنی عملی زندگی میں بنی نوع انسان کے ساتھ محبت کا اظہار صرف اس طرح کر سکتے ہیں کہ ان کی خاطر ادنیٰ ترین امور کو بھی فروتنی سے پورا کریں (متی ۲۵: ۳۵۔۴۵؛ یوحنا ۱۳: ۱۴ وغیرہ)۔ جہاں محبت نہیں وہاں حقیقی فروتنی اور حلم نہیں۔ لیکن جہاں محبت ہے۔ وہاں بے جا تحکم، لاف گزاف، خود نمائی، غرور و فخر کی گنجائش نہیں (۲۔ کرنتھیوں ۱۰: ۱۴ وغیرہ)۔ بلکہ محبت کی موجودگی نفس کشی، حقیقی حلم اور اصلی فروتنی کا باعث ہوتی ہے۔

نتیجہ

ناظرین پر ظاہر ہو گیا ہو گا کہ مسیحیت ذات کے اظہار کی جبلّت کو الٰہی محبت اور انسانی اخوت کے اصول کے تحت کر کے اس جبلّت کی جائز اور مناسب نشوونما کرتی ہے۔ انجیل کی یہ تعلیم ہے کہ بنی نوع انسان کی فلاح اور بہبودی کی خاطر ادنیٰ ترین کام محبت کے جذبہ سے سرشار ہو کر کیا جائے۔ منجی عالمین کا نمونہ ہمارے لئے سراج ہدایت ہے تاکہ اس خدمت کو سرانجام دینے کے لئے ہم ہر طرح کے ایثار اور قربانی کو عمل میں لا سکیں۔ خلق نے اس جبلّت کو اسی غرض کے لئے ہمارے سرشت میں ودیعت فرمایا ہے۔ لہٰذا جہاں تک اس جبلّت کا تعلق ہے۔ مسیحیت ہی دینِ فطرت ہو سکتا ہے۔

فصل نہم

جبلّت حصول واکتساب

جبلّت حصول وخصوصیات اکتساب کی

ہر انسان میں اشیا کو فراہم کرنے اور ذخیرہ جمع کرنے کی اقتضا کسی نہ کسی صورت میں پائی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ جبلّت اس کی سرشت میں داخل ہے۔ اس دنیا میں کوئی بچہ ایسا نہیں جو بالغ ہونے تک اور اس کے بعد بھی کسی نہ کسی قسم کی اشیا کو جمع نہ کرے۔ بچپن میں عموماً اس ذخیرہ کے جمع کرنے کا کوئی خاص مقصد نہیں ہوتا۔ کیونکہ اکتساب وحصول کی جبلّت انسانی فطرت میں داخل ہے۔

انسانی زندگی میں یہ جبلّت ان پیچیدہ تسویقات اور جذبات کا باعث ہوتی ہے۔ جن کا تعلق ملکیت اور قبضہ کے ساتھ ہے۔ یہی جبلّت سرمایہ اور دولت کے فراہم کرنے میں مدد دیتی ہے۔

(۲)

اس جبلّت کا یہ خاصہ ہے کہ اس کی تسکین نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی خواہش روز افزوں ہے۔ دیگر خواہشات ایک خاص نقطہ پر پہنچ کر ساکن ہو جاتی ہیں۔ اور ان کی کامل تسکین ہو جاتی ہے۔ مثلاً جب انسان ایک خاص عمر کو پہنچ جاتا ہے۔ تو اس میں نر اور مادہ کی خواہش باقی نہیں رہتی۔ لیکن اس جبلّت کا یہ خاصہ ہے کہ اس کی خواہش روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ گویا جمع کرنے کے جنون کو تسکین سے آگاہی نہیں۔ ایسے انسان بہت ہی کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ جو اپنی خواہشوں کی تسکین کے لئے صرف مایحتاج پر ہی قناعت کرتے ہیں۔ کسی دوسری جبلّت کے اقتضا کے حصول کے لئے اس قدر کدوکاوش نہیں کی جاتی۔ جتنی دولت کو جائز اور ناجائز طریقوں مثلاً قمار بازی وغیرہ سے جمع کرنے یا سرمایہ کو فراہم کرنے یا زمین اور مکان کی ملکیت کو حاصل کرنے یا ملک گیری وغیرہ کے لئے کی جاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس جبلّت میں فاسد (خراب) افراط (کثرت) کی صلاحیت موجود ہے۔

جبلّت حصول اور دینِ فطرت کے لوازمات

دینِ فطرت کا یہ کام ہے کہ اس جبلّت کے رجحان کو ہیچ، کم مایہ بے حقیقت اور ادنیٰ اشیا کی طرف سے ہٹا کر ایسے اعلیٰ ترین مقاصد کو حاصل کرنے کی جانب راغب کرے۔ جن سے انسان کی اپنی ذاتی ترقی اور بنی نوع انسان کی بہبودی مقصود ہے۔ دینِ فطرت کا یہ بھی کام ہے کہ اس جبلّت میں جو فاسد افراط کی صلاحیت موجود ہے۔ اس کا علاج کرے تاکہ انسان اس جبلّت کی روز افزوں خواہش کو قابو میں رکھ سکے۔

جبلت حصول اور مسیحیت کی تعلیم

مسیحیت ہم کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ دولت ایک بے مایہ، ہیچ، ادنیٰ اور بے حقیقت شے ہے۔ اور ہماری زندگی کا یہ نصب العین ہر گز نہیں ہونا چاہیے۔ کہ ہم اس کے جمع کرنے میں منہمک ہو جائیں۔ "مال دار ہونے کے لئے پریشان نہ ہو۔ کیا تو اس چیز پر آنکھ لگائے گا۔ جو بے حقیقت ہے۔ کیونکہ دولت پر لگا کر اڑ جاتی ہے" (امثال ۲۴: ۴)۔ "تم خداوند اپنے خدا کا شکر بجالاؤ۔ خبر دار کہیں ایسا نہ ہو کہ جب تم کھا کر سیر ہو۔ اور خوش نما گھر بنا کر ان میں رہنے لگو۔ اور تمہارے پاس چاندی، سونا، اور مال بکثرت ہو جائے۔ تو تم خداوند اپنے خدا کو بھول کر اس کے فرمانوں اور احکام اور آئین کو ماننا چھوڑ دو (استثنا ۹: ۱۱)۔ "صادق کا تھوڑا سا مال شریروں کی بہت سی دولت سے بہتر ہے" (زبور ۳۷: ۱۶)۔ "جو کوئی اپنے آپ کو دولتمند بناتا ہے۔ وہ نادار ہے۔ اور جو کوئی اپنے آپ کو کنگال بناتا ہے وہ بڑا مالدار ہے" (امثال ۱۳: ۷)۔ "تھوڑا جو خداوند کے خوف کے ساتھ ہو۔ بڑے گنج سے بہتر ہے" (امثال ۱۵: ۱۶)۔ "درغگوئی سے خزانے حاصل کرنا بے ٹھکانہ نجات کی مانند ہے۔ اور اس کے طالب موت کے طالب ہیں" (امثال ۲۱: ۶)۔ "زر دوست روپیہ سے آسودہ نہ ہو گا۔ اور دولت کا چاہنے والا اس کے بڑھنے سے سیر نہ ہو گا۔ یہ بھی بطلان ہے" (واعظ ۵: ۱۰)۔ کلمتہ اللہ نے فرمایا کہ "اس دنیا میں بہت آدمی ایسے ہیں۔ جو خدا کا کلام تو سنتے ہیں لیکن دنیا کا فکر اور دولت کا فریب اس کلام کو دبا دیتا ہے۔ اور وہ بے پھل رہ جاتا ہے" (متی ۱۳: ۲۲)۔ آپ نے اپنے رسولوں سے فرمایا۔ "جو لوگ دولت پر بھروسا رکھتے ہیں۔ ان کے لئے خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا نہایت مشکل ہے۔ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو" (مرقس ۱۰: ۲۳)۔ آپ نے لوگوں کو زر سے محبت کرنے کے خلاف خبر دار فرمایا اور کہا کہ "اگر آدمی ساری دنیا حاصل کرلے اور اپنی روح کا نقصان اٹھائے تو اسے کیا فائدہ ہو گا؟ آدمی اپنی جان کے بدلے کیا دے گا؟" (متی ۱۶: ۲۶)۔ آپ نے فرمایا "کوئی نوکر دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یا تو ایک سے عداوت رکھے گا اور دوسرے سے محبت، یا ایک سے ملا رہے گا اور دوسرے کو ناچیز جانے گا۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے" (لوقا ۱۶: ۱۳)۔ اور پھر فرمایا "اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو۔ جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے۔ اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں۔ بلکہ اپنے لئے آسمان پر مال جمع کرو۔ جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے نہ زنگ، اور نہ وہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں۔ کیونکہ جہاں تیرا مال ہے۔ وہیں تیرا دل بھی لگا رہے گا" (متی ۱۶: ۱۹)۔ آپ نے دولت کی کمائیگی۔ اور اس کے ساتھ محبت رکھنے کی ناعاقبت اندیشی کو ظاہر کرنے کے لئے ایک تمثیل فرمائی اور کہا کہ "کسی دولت مند کی زمین پر بڑی فصل ہوئی۔ پس وہ اپنے دل میں سوچ کر کہنے لگا کہ میں کیا کروں کہ میرے ہاں جگہ نہیں کہ جہاں اپنی پیداوار بھر رکھوں اس نے کہا میں یہ کروں گا کہ اپنی کوٹھیاں ڈھا کر ان سے بڑی بناؤں گا اور ان میں اپنا سارا اناج اور مال بھر رکھوں گا۔ اور اپنی جان سے کہوں گا اے جان تیرے پاس برسوں کے لئے بہت سا مال جمع ہے چین کر۔ کھا پی اور خوش رہ۔ مگر خدا نے اس سے کہا اے نادان اسی رات تیری جان تجھ سے طلب کر لی جائے گی۔ پس جو تو نے تیار کیا ہے وہ کس کا ہو گا۔ ایسا ہی وہ شخص ہے۔ جو اپنے لئے خزانہ جمع کرتا ہے۔ اور خدا کے نزدیک دولت مند نہیں۔ اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی جان کی فکر نہ کرو۔ کہ ہم کیا کھائیں گے اور اپنے بدن کا کہ کیا پہنیں گے۔ کیونکہ جان خوراک سے بڑھ کر ہے۔ اور بدن پوشاک سے ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں۔ نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں۔ تو بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے۔ اور پوشاک کے

لئے کیوں فکر کرتے ؟جنگلی سوسن کے پھولوں کو غور سے دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے نہ کاتتے ہیں۔ تو بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی ساری شان وشوکت کے ان میں سے کسی کی مانند پوشاک پہنے ہوئے نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے۔ او رکل تنور میں جھونکی جائے گی ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو۔ تم کو کیوں نہ پہنائے گا؟ پس تم اس کی تلاش میں نہ رہو کہ کیا کھائیں گے اور کیا پہنیں گے۔ اور نہ شاکی بنو، کیونکہ تمہارا باپ جانتا ہے کہ تم ان کے محتاج ہو ہاں خدا کی بادشاہت کی تلاش میں رہو۔ تو یہ چیزیں بھی تم کو مل جائیں گی" (لوقا ۱۲باب؛ متی ٦باب) آپ نے فرمایا"خبردار اپنے آپ کو ہر طرح کے لالچ سے بچائے رکھو۔ کیونکہ کسی شخص کی زندگی اس کے مال کی کثرت پر موقوف نہیں"(لوقا ۱۲: ۱۵) "فانی خوراک کے لئے محنت نہ کرو۔ بلکہ اس خوراک کے لئے جو ہمیشہ کی زندگی تک ٹھہرتی ہے"(یوحنا٦: ۲۷)۔ سیدنا مسیح کے رسول بھی فرماتے ہیں"نہ دنیا سے محبت رکھو۔ نہ ان چیزوں سے جو دنیا میں ہیں۔ جو کوئی دنیا سے محبت رکھتا ہے۔ اس میں باپ کی محبت نہیں" (۱۔یوحنا۲: ۱۵)۔"جس کے پاس دنیا کا مال ہو اور وہ اپنے بھائی کو محتاج دیکھ کر رحم کرنے میں دریغ کرے۔ تو اس میں خدا کی محبت کیوں کر قائم رہ سکتی ہے"(یوحنا۳: ۱۷)۔ حضرت یعقوب کہتے ہیں"اے دولتمند تمہارا مال بگڑ گیا تمہاری پوشاکوں کو کیڑا کھا گیا۔ تمہارے سونے چاندی کو زنگ لگ گیا" (یعقوب ۵: ۱)۔"زر کی محبت سے خالی رہو۔ اور تمہارے پاس ہے اس پر قناعت کرو۔ کیونکہ خدا نے خود فرمایا ہے کہ میں تجھ سے دستبردار نہ ہوں گا۔ اور کبھی تجھے نہ چھوڑوں گا"(عبرانیوں ۱۳: ۵)۔ حضرت پولُس فرماتے ہیں"بہترے ایسے ہیں جن کا خدا پیٹ ہے۔ اور وہ دنیا کی چیزوں کے خیال میں رہتے ہیں۔ وہ مسیح کی صلیب کے دشمن ہیں۔ اور ان کا انجام ہلاکت ہے۔ مگر ہمارا وطن آسمان پر ہے"(فلپیوں ۳: ۱۹)۔ لالچ، بت پرستی کے برابر ہے (کلسیوں ۳: ۵)۔"دینداری قناعت کے ساتھ بڑے نفع کا ذریعہ ہے۔ کیونکہ نہ ہم دنیا میں کچھ لائے اور نہ کچھ اس میں سے لے جاسکتے ہیں۔ پس اگر ہمارے پاس کھانے اور پہننے کو ہے۔ تو اسی پر قناعت کریں۔ لیکن جو دولتمند ہونا چاہتے ہیں۔ وہ ایسی آزمائش اور پھندے اور بہت سی بے ہودہ اور نقصان پہنچانے والی خواہشوں میں پھنستے ہیں۔ جو آدمیوں کو تباہی اور ہلاکت کے دریا میں غرق کر دیتی ہے۔ کیونکہ زر کی محبت ہر قسم کی برائی کی جڑ ہے ۔اس موجودہ جہان کے دولتمندوں کو حکم دے کر مغرور نہ ہوں اور ناپائیدار دولت پر نہیں۔ بلکہ خدا پر امید رکھیں۔ اور اچھے کاموں میں دولت مند بنیں"(۱۔ تیمتھیس ٦باب)۔

(۲)

سطور بالا سے ظاہر ہے کہ مسیحیت جبلّت حصول واکتساب کو ناکارہ نہیں بتلاتی۔ یہ ہماری سرشت میں داخل ہے۔ لہٰذا مسیحیت اس جبلّی فطرت کو ضائع نہیں کرتی۔ بلکہ اس جبلّت کے رجحان کو زور ومال جیسی بے حقیقت اشیا کے جمع کرنے کی طرف سے ہٹا کر اس کا رخ اعلیٰ مقاصد کی طرف کر دیتی ہے۔ کلمتہ اللہ نے یہ سبق ذہن نشین کرنے کے لئے ایک تمثیل فرمائی کہ"ایک شخص نے بڑی ضیافت کی۔ اور بہت سے لوگوں کو بلایا۔ اور کھانے کے وقت اپنے نوکر کو بھیجا۔ کہ بلائے ہوؤں سے کہو کہ آؤ۔ اب کھانا تیار ہے۔ اس پر سب نے مل کر عذر کرنا شروع کیا پہلے نے اس سے کہا کہ میں نے کھیت خریدا ہے مجھے ضرور ہے کہ جاکر اسے دیکھوں میں تیری منت کرتا ہوں۔ مجھے معذور رکھ۔ دوسرے نے کہا میں نے پانچ جوڑی بیل خریدے ہیں۔ ان کو آزمانے جاتا ہوں۔ میں تیری منت کرتا ہوں ۔ مجھے معذور رکھ۔ ایک اور نے کہا میں نے بیاہ کیا ہے ۔ اس سبب سے نہیں آسکتا۔" (لوقا ۱۴:

۱۴۔۱۶)۔اس تمثیل کے ذریعہ سیدنا مسیح ہم کو بتلاتے ہیں کہ جب لوگوں کو خدا کی بادشاہت کی قبولیت کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ اس مقدم اور اہم مقصد کو چھوڑ کر اپنی توجہ مقابلتاً ہیچ اور کم مایہ اشیا میں لگا دیتے ہیں۔جناب مسیح نے یہ مقصد نہیں کہ زر اور مال اور دیگر دنیاوی اشیا بذات خود بری ہیں۔ لیکن آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک شے اپنی اپنی جگہ قدر اور وقعت رکھتی ہے۔اور کسی شے کو اس کی جائز اور مناسب قدر سے زیادہ وقعت دنیا فطرت کے خلاف ہے ایک کم قدر شے کو وقعت دے کر مقدم جاننا اور مقدم شے کو بے وقعت اور موخر شمار کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہم جبلّت حصول واکتساب کے رجحان کو مقدم مقاصد سے ہٹا کر بے حقیقت اشیا کی جانب راغب کر رہے ہیں۔اور غیر فطرتی حرکات کے مرتکب ہو رہے ہیں۔دنیا کا زر ایک ایسی شے ہے۔جس سے ہم کو محبت نہیں رکھنی چاہیے دولت کے جمع کرنے کا جنون ایک کم مایہ ادنیٰ اور ہیچ شے ہے۔اور جب خالق نے جبلّت حصول واکتساب کو ہماری سرشت میں ودیعت فرمایا۔تو اس کا ہرگز یہ مدعا نہ تھا کہ ہم ایسی جبلّت کی طاقت اور توانائی (جس کی کبھی تسکین نہیں ہوتی بلکہ جس کی خواہش روز افزوں ہے) ایسی کم مایہ اور ہیچ شے کے حصول میں صرف کر دیں۔

(3)

مسیحیت کی آمد نے اس دنیا کی مختلف اشیا کی وقعت کے تصورات میں عظیم الشان تبدیلیاں پیدا کر کے دنیا کے اخلاق کی کایا پلٹ دی۔کلمتہ اللہ کی بعثت سے پہلے اقوام عالم کے ممتاز ترین افراد وہ سمجھے جاتے تھے۔جو اکتساب زر دولت۔حصول عزت و مرتبت، جاہ اور شوکت، ملک گیری اور شہنشاہیت وغیرہ میں سب سے زیادہ کوشاں ہوتے تھے۔اقوام عالم کا یہ خیال تھا کہ "مبارک ہیں وہ جو دولتمند ہیں"۔کلمتہ اللہ نے فرمایا "مبارک ہو تم جو غریب ہو" (لوقا ۶: ۲۰)۔اور "افسوس تم پر جو دولتمند ہو" (لوقا ۶: ۲۴)۔ان کا خیال تھا کہ "بدنصیب ہیں وہ جو بھوکے ہیں"۔کلمتہ اللہ نے فرمایا "مبارک ہو تم جو بھوکے ہو" (لوقا ۶: ۲۰)۔اور "افسوس تم پر جو سیر ہو" (لوقا ۶: ۲۵)۔ان کا یہ خیال تھا کہ "مبارک ہیں وہ جن کی زندگی عیش اور ہنسی میں گذرتی ہے"۔کلمتہ اللہ نے فرمایا "مبارک ہو تم جو روتے ہو"۔اور "افسوس تم پر جو ہنستے ہو" (لوقا ۶: ۲۵)۔ان کا یہ خیال تھا کہ مبارک ہیں وہ لوگ جن کو تمام لوگ تحسین و آفرین کہیں۔لیکن کلمتہ اللہ نے فرمایا "تم مبارک ہو گے۔جب لوگ تم کو ستائیں گے اور ہر طرح کی بری باتیں تمہاری نسبت ناحق کہیں گے"۔ (متی ۵: ۱۱)۔اور "افسوس تم پر جب سب لوگ تم کو بھلا کہیں" (لوقا ۶: ۲۶)۔اقوام عالم کا یہ خیال تھا کہ جاہ اور عزت اور لوگوں پر حکومت چلانے کی طاقت کا حاصل کرنا ہماری زندگی کا نصب العین ہونا چاہیے اس کے برعکس کلمتہ اللہ نے تعلیم دی کہ خلق خدا کی خدمت ہمارا مطمع نظر ہونا چاہیے۔اور کہ حکومت اور اختیار جتانے کی روح اچھی نہیں اور فرمایا "تم جانتے ہو کہ اقوام عالم کے سردار ان پر حکومت چلاتے اور امرا ان پر اختیار جتاتے ہیں۔لیکن تم میں ایسا نہ ہو گا۔بلکہ جو تم میں بڑا ہونا چاہے۔وہ تمہارا خادم بنے۔اور جو تم میں اول ہونا چاہے۔وہ تمہارا غلام بنے۔چنانچہ ابن آدم اس لئے نہیں آیا کہ خدمت لے بلکہ اس لئے کہ خدمت کرے اور اپنی جان بہتیروں کے بدلے فدیئے میں دے" (متی ۲۰: ۲۵)۔پس جناب مسیح نے خلق خدا کی خدمت کو مقدم اور دولت جاہ عزت اور حکومت وغیرہ کے حصول کو خلق خدا کی خدمت کا محض ایک وسیلہ مقرر کر دیا۔چنانچہ ایک دفعہ ایک ایسا شخص جناب مسیح کے پاس آیا۔جس نے حصول زر کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا رکھا تھا۔اور آپ سے پوچھنے لگا کہ میں کیا کروں کہ ہمیشہ کی زندگی کا وارث بنوں۔آپ نے فرمایا "کہ جو مال تو نے جمع کیا ہے اس کو خلق خدا کی خدمت میں صرف کر" (مرقس ۱۰: ۲۱)۔لیکن اس بات

سے ”اس کے چہرے پر اداسی چھاگئی۔ اور وہ غمگین ہو کر چلا گیا۔ کیونکہ وہ بڑا مالدار تھا“۔ پس سیدنا مسیح نے فرمایا۔ جو لوگ اکتساب زر دوولت اور حصول عزت جاہ کی خاطر زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے لئے خدا کی بادشاہت میں داخل ہونانہایت مشکل ہے۔ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گذر جانا اس سے آسان ہے کہ ایسا دولتمند اس میں داخل ہو۔ جو اپنی دولت اور مرتبت کو خلق خدا کی خدمت اور خدا کی بادشاہت کے قیام اور وسعت کی خاطر خرچ کرنے سے دریغ کرتا ہے۔ جناب مسیح نے خدا کی بادشاہت کے تصور کو مقدم ٹھہرا کر تمام دیگر امور کو اس ایک نصب العین کے ماتحت کر دیا۔ اور عالم اخلاقیات میں عظیم الشان تبدیلی پیدا کر دی۔ منجی عالمین نے ہماری جبلّت حصول واکتساب کی جبلّت کے رخ کو کم مایہ۔ بے حقیقت اور ناکارہ اشیا کی طرف سے ہٹادیا۔ اور حکم دیا کہ چندروزہ اور فانی امور کو نصب العین بنا کر ان کو حاصل کرنے کی بجائے ان کو اعلیٰ ترین غیر فانی مقاصد کے ماتحت اور ان کے حصول کا وسیلہ بنادیں (یوحنا ۶: ۲۷)۔ تاکہ جبلّت حصول کا حقیقی منشا جو خالق کے ارادہ کے مطابق ہے پورا ہو جائے۔ اور یوں ہماری فطرت کا اصلی تقاضا پورا ہو جائے۔

پس جنابِ مسیح نے ایک نصب العین ہماری آنکھوں کے سامنے رکھ دیا ہے کہ جس کے حاصل کرنے کے لئے ہم اس جبلّت کی پوری طاقت کو استعمال کر سکتے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ ”مقدم بات یہ ہے کہ تم خدا کی بادشاہت اور اس کی راستبازی کو حاصل کرو“ (متی ۶: ۳۳)۔ اس اعلیٰ ترین مقصد کے حاصل کرنے میں انسان اپنی جان اور روح کی ترقی اور بنی نوع انسان کی ترقی کا باعث ہو سکتا ہے۔

آپ نے تمثیلوں کے ذریعہ خدا کی بادشاہت کا مقدم ہونا لوگوں پر ظاہر کیا اور فرمایا کہ ”آسمان کی بادشاہت اس سوداگر کی مانند ہے جو عمدہ موتیوں کی تلاش میں تھا۔ جب اسے ایک بیش قیمت موتی ملا تو اس نے جا کر جو کچھ اس کا تھا۔ بیچ ڈالا۔ اور اسے مول لے لیا۔ آسمان کی بادشاہت ایک چھپے خزانہ کی مانند ہے۔ جس کو کسی آدمی نے پا کر چھپادیا۔ اور خوشی کے مارے جا کر جو کچھ اس کا تھا۔ بیچ ڈالا۔ اور اس کھیت کو مول لے لیا“ (متی ۱۳ باب)۔ خدا کی بادشاہت ایک ایسا بیش بہا نصب العین ہے۔ جس کو حاصل کرنے کی خاطر تمام وسائل استعمال کرنے چاہیں۔ اس کی وقعت اس قدر ہے کہ باقی ہر شے گو بظاہر قابل قدر معلوم ہوتی ہو۔ لیکن اس کے مقابلہ میں اس کی قدر ہیچ ہے۔ جس طرح بیش قیمت موتی کے مقابلے میں باقی تمام موتیوں کی وقعت ہیچ تھی۔ اگرچہ وہ موتی بھی اپنی اپنی جگہ قابل قدر تھے۔ خدا کی بادشاہت کی قدر اور وقعت اتنی رفیع اور بلند ہے۔ کہ اس کے قیام اور وسعت کی خاطر ابن اللہ نے اپنی جان دے دی۔

(4)

ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ جبلّت واکتساب میں فاسد افراط کی صلاحیت موجود ہے۔ دینِ فطرت کا یہ کام ہے کہ فاسد صلاحیت کی روک تھام کرے۔ کلمتہ اللہ نے اس صلاحیت کو یوں زائل کیا کہ آپ نے اس صلاحیت کی روز افزوں خواہش کو خدا کی بادشاہت کی بنا، قیام، پائیداری، اور استواری کے حصول کے ماتحت کر دیا۔ یوں اس کے افراط میں جو فساد کا امکان تھا وہ جاتا رہا۔ خدا کی بادشاہت کے قیام اور پائیداری میں ہم جتنی بھی کوشش کریں گے۔ وہ کم ہو گی۔ اور اس سے کسی فرد بشر کو نقصان اور گزند پہنچنے کا اندیشہ نہیں۔ اگر ہم اس جبلّت کے رجحان کو اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول یعنی خدا کی بادشاہت

اور اس کی راستبازی کو حاصل کرنے کی جانب راغب کریں گے۔ تو چونکہ اس جبلّت کا خاصہ ہے کہ اس کی تسکین کبھی نہیں ہوتی۔ اور اس کی خواہش روز افزوں ہے۔ تو ہم اس نصب العین کو حاصل کرنے کی روز افزوں کوشش کریں گے اور اس نصب العین کے حصول کے افراط سے ہم کو اور بنی نوع انسان کو کسی قسم کا گزند (صدمہ) پہنچنے کا خدشہ بھی نہیں ہے۔ برعکس اس کے جب اس اعلیٰ نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے ہماری کوشش لگاتار جاری رہے گی تو جتنی اس کوشش کو تسکین نہیں ہو گی اسی قدر اس کی روز افزوں خواہش ہماری روح کی بہبودی اور انسانی ترقی اور فلاح کے لئے مبارک اور فائدہ مند ثابت ہو گی۔ ہم ہر وقت اسی کوشش میں ہوں گے کہ خدا کی بادشاہت اس دنیا میں قائم ہو جائے (متی ۴: ۱۷ وغیرہ)۔ اور دعا کریں گے کہ اس دنیا کا کاروبار خدا کی راستبازی کے اصولوں پر چلے (متی ۶: ۹)۔ پس کلمتہ اللہ نے جبلّت حصول واکتساب کی افراط میں جو فساد کی صلاحیت تھی۔ اس کا سدباب کر دیا آپ کی تعلیم نے اس صلاحیت کو اعلیٰ ترین نصب العین کے ماتحت کر کے اس کی توانائی اور قوت کو خدا اور اس کی بادشاہت اور اس کی راستبازی کی تحصیل میں خرچ کر دیا۔

جبلّت حصول واکتساب اور قرآنی تعلیم

قرآن میں ایسی آیات پائی جاتی ہیں۔ جو زر اور دولت کے حصول کو ہیچ اور ادنیٰ بتلاتی ہیں۔ ”جس نے مال جمع کیا۔ اور گن گن کر رکھا سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا۔ ہر گز نہیں۔ وہ تو روندنے والی (دوزخ کی آگ) میں پھینکا جائے گا“ (ہمزہ آیت ۲و6، آل عمران ۱۲، انفال ۲۸، کہف 43و44، انعام ۳۲، حجر 88، طٰہٰ 131 وغیرہ)۔

(۲)

لیکن ایک طرف تو قرآن ان چیزوں کو کم مایہ قرار دیتا ہے۔ لیکن دوسری طرف انہی چیزوں کو بہترین مرغبات میں شمار کر کے مال غنیمت وغیرہ کے ذریعہ لوگوں کو جہاد کے لئے ابھارتا ہے (سورہ انفال ۱و۴۲ سورہ فتح 15)۔ ”جو تم لوٹ کے لائے حلال پاک ہے تم کھاؤ“ (انفال 70)۔ یوں قرآن اس دنیا کے مال واسباب (اور مال بھی ایسا جو لوٹ کے ذریعہ حاصل کیا ہو) کی کم مائیگی کے اصول کو خود ہی زائل کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن نے یہ اجازت دے رکھی ہے کہ روپیہ کے ذریعہ لوگوں کے دل اسلام کی طرف راغب کرنا جائز ہے (توبہ آیت 160)۔ یوں روپیہ کی محبت اور لالچ کی روز افزوں خواہش لوگوں کے دلوں میں جاگزین ہو جاتی ہے۔ اس کی بجائے کہ دنیا اور زر کی محبت کا استیصال ہو جبلّت حصول واکتساب کا افراط میں جو فساد کی صلاحیت ہے۔ اس کو تقویت ملتی ہے۔ انسان کا یہی جی چاہتا ہے کہ لوٹ کے ذریعہ جبلّت حصول واکتساب کی خواہش کو پورا کرے۔ یہی وجہ ہے کہ دور حاضرہ میں بھی عرب کے مسلمان بدوؤں کو دنیائے اسلام کے حاجیوں کو لوٹ لینے سے باز رکھنا ایک نہایت مشکل امر ہے۔

(3)

علاوہ ازیں قرآن جبلّت حصول کی قوت کو کم مایہ اور ہیچ اشیاء کی جانب سے ہٹا کر اس کی رجحان کا رخ کسی دوسرے مقصد اعلیٰ کے ماتحت نہیں کرتا۔ قرآن میں کوئی تعمیری پروگرام یا نصب العین نہیں۔ جس طرح انجیل جلیل میں "خدا کی بادشاہت" کا نصب العین ہے۔ بالفرض اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ قرآن دولت دنیا کو ہیچ جانتا ہے۔ اور نہیں چاہتا ہے کہ جبلّت حصول کی طاقت زر کے حصول میں خرچ ہو۔ تو سوال یہ ہے کہ پھر یہ طاقت کس بات کے حصول میں خرچ کی جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ جبلّت ہماری سرشت میں داخل ہے۔ اور حضرت رسول عربی ﷺ اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ اس جبلّت کی تسکین نہیں ہوتی۔ چنانچہ مشکوٰۃ کتاب الرقاق میں انس سے روایت ہے کہ

> "آنحضرت نے فرمایا کہ آدمی تو بوڑھا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس میں دو چیزیں جوان اور قوی رہتی ہیں۔ یعنی مال کی حرص اور درازی عمر کی خواہش"۔

پس ضرور ہے کہ انسان کے سامنے کوئی تعمیری پروگرام یا نصب العین ہو جس کی جانب اس جبلّت کی قوت کو راغب کرے اور جس کو حاصل کرنے کے لئے وہ دل و جان سے کوشش کرے۔ لیکن قرآن اس بارے میں بالکل خاموش ہے۔ اور اگر اس کے پاس مطمع نظر ہے۔ تو بس نعمہائے بہشت ہیں۔ جن کے ذکر سے قرآن کے صفحوں کے صفحے بھرے پڑے ہیں (محمد ۱۲و۱۷، صفت 39 تا 47، نبا 30، دہر 13، طور ۲۴، غاشیہ 15، واقعہ ۲۲و35، روم 14، کہف 30، رحمن 46 تا 72، دخان 51 تا 55، وغیرہ وغیرہ)۔ لیکن کسی سلیم الطبع شخص کے نزدیک قرآنی نعمہائے بہشت صحیح مرغبات میں شمار نہیں ہو سکتے۔

(4)

پس قرآن و اسلام جبلّت حصول و اکتساب کی قوت کو ہیچ اور کم مایہ بے حقیقت اور ادنیٰ اشیا کی طرف سے نہیں ہٹاتا۔ اس کی طاقت کے رجحان کو کسی اور بہتر مقصد اور نصب العین کی جانب نہیں کر سکتا۔ جس سے بنی نوع انسان کی بہبودی مقصود ہے۔ اس جبلّت میں جو فاسد افراط کی صلاحیت موجود ہے۔ اس کے روک تھام کا اسلام کے پاس کوئی علاج نہیں۔ غرضیکہ جہاں تک اس جبلّت کا تعلق ہے۔ اسلام دین ِ فطرت نہیں ہو سکتا۔

نتیجہ

مسیحیت جبلّت حصول و اکتساب کے اقتضاء کو تسلیم کر کے اس رجحان کو زر جیسی بے حقیقت اشیاء سے ہٹا دیتی ہے۔ اور اس کا رُخ بہتر اور اعلیٰ مقاصد کے حاصل کرنے کی جانب لگاتی ہے۔ جن سے انسان کی انانیت کی ترقی اور بنی نوع انسان کی فلاح اور بہبودی مقصود ہے۔ یوں مسیحیت نے مختلف مقاصد کی قدر اور منزلت کے تصورات میں عظیم الشان تبدیلی کر کے دنیائے اخلاق کی کایا پلٹ دی ہے۔ انجیلِ جلیل نے اس جبلّت کی افراط میں جو فساد کی صلاحیت موجود تھی۔ اس کی روک تھام اس طرح سر انجام دی کہ خدا کی بادشاہت کا نصب العین ہماری نظر کے سامنے رکھ دیا، تاکہ اس تعمیری

پروگرام پر عمل کر کے انسان اپنی انانیت کی اور بنی نوع انسان کی فلاح اور بہبودی کا باعث ہو جائے۔ پس جہاں تک جبلّت ِ حصول واکتساب کا تعلق ہے۔ مسیحیت اس کے تمام اقتضاؤں کو بوجہ احسن پورا کر کے اربابِ دانش پر ثابت کر دیتی ہے کہ وہ دینِ فطرت ہے۔

اشتراکیت اور مسیحیت

(۱)

فی زمانہ بے روزگاری کے مسئلہ نے ہندوستان کی توجہ اپنی طرف ایسی جذب کرلی ہے کہ لوگ کسی اور مسئلہ کی جانب توجہ ہی نہیں دیتے۔ جدھر آنکھ اٹھاؤ بے روزگاروں اور بے کاروں کی قطار ور قطار نظر آتی ہے۔ ہر طرف سے ایک ہی صدا کانوں میں پڑتی ہے۔ کہ "چور خور و بامدا فرزندم" ہائے روٹی" کی چیخ وپکار کے سامنے دنیا کا ہر قسم کا شور اور غل مدھم پڑ گیا ہے۔ دورِ حاضرہ میں کسی شخص کے لئے اور بالخصوص تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے کوئی ایسا امر دلچسپی کا باعث نہیں ہوتا جس کا تعلق روٹی کے ساتھ نہ ہو۔ ہندوستان کی موجودہ سیاسیات میں اقتصادیات کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ مذہبی اصول اور دینیات تک کو اس کے تحت کر دیا گیا ہے۔ اور ان کو ذریعہ معاش بنا دیا گیا ہے۔ مختلف مذاہب کے پیرو اپنے اپنے مذہب کی آڑ میں اپنے ذاتی اغراض ومقاصد کو پورا کر کے اس مقولہ پر عمل کر رہے ہیں کہ "ایمان برائے طاعت ومذہب برائے جنگ"۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گیا ہے کہ فرقہ وارانہ شعلوں نے کشمیر بے نظیر سے لے کر راس کماری تک ہندوستان بھر میں آگ لگا دی ہے۔ اور ہندوستان جو تیس (۳۰) سال پہلے دارالامان تھا۔ اب باہمی نزاع اور نفاق کی وجہ سے دارالحرب بن گیا ہے۔ اندریں حالات دورِ حاضرہ کے نوجوان جن کے آباؤ اجداد خدا اور مذہب کے نام پر مرمٹنا سعادت دارین کا موجب سمجھتے تھے۔ وہ مذہب کے نام سے نہ صرف بیزار دکھائی دیتے ہیں۔ بلکہ مذہبی مباحث اور دینی مشاغل سے متنفر ہو کر ان سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ ان کی نظریں مشرق کے انبیا اور ہندوستان کے اولیا کی طرف سے ہٹ کر روس کی جانب جا لگی ہیں۔ جہاں بے روزگاری زمانہ ماضی کی داستان پارینہ ہو چکی ہے اور اشتراکیت نے مصنوعی درجہ بندیوں کو مٹا کر ہر ایک شخص کے لئے روٹی، تعلیم، رہائش اور آسائش کا انتظام کر کے مواسات (مدد، غم خواری، درگزر، صلح) کو عالم امکان سے عالم وجود میں لا کر پردہ شہود پر رونما کر دیا ہے۔ اور اب ہر روشن خیال شخص یہ سوال پوچھتا ہے۔ کہ اگر اشتراکیت (ساجھا، ایک اعتدال پسند فلسفہ یا نظریہ حیات جس کے مطابق ذرائع پیداوار پر عوام کی مشترکہ ملکیت ہونی چاہیے) نے روس جیسے پس ماندہ ملک میں بیس (۲۰) سال کے اندر اعجازی کرشمے دکھا کر انقلاب برپا کر دیا ہے۔ تو کیا ہندوستان کے لئے اشتراکیت کا قیام اس کے اقتصادی مسائل کے لئے نفع بخش نہیں ہو گا؟ ہندوستان کے کروڑوں باشندوں کے لئے یہ سوال زندگی اور موت کا سوال ہو گیا ہے۔

(۲)

اگر بنظر تعمیق (دور اندیشی سے کام لینا، غور) دیکھا جائے۔ تو اقتصادی معتقدات اور موجودہ حالات کے اندر فساد کی جڑ تقابل اور Competition ہے۔ ہماری اقتصادی عمارت مقابلہ کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے۔

پس۔۔۔

خشت اول چوں نہد معمار کج

تا ثریا مے رود دیوار کج

مقابلہ کی روح کی یہ خصوصیت ہے کہ ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ دوسروں کو جائز و ناجائز طریقوں سے پچھاڑ کر خود آگے بڑھے۔ پس موجودہ اقتصادیات اس دوڑ کی مانند ہے۔ جس میں ہر شخص اسی سر توڑ کوشش میں لگا رہتا ہے۔ کہ میں کامیاب ہو کر دوسروں سے گوئے سبقت لے جاؤں۔ اور باقی تمام حریف دیوالیہ ہو جائیں۔ پس خودی اور طمع سرمایہ داری کی عمارت کے بنیادی پتھر ہیں۔ جو ہر قسم کے اتفاق، یگانگت اور محبت کے جانی دشمن ہیں۔ اب تلخ تجربہ نے ہم پر ظاہر کر دیا ہے کہ مغرب کے زیر اثر مانچسٹر کے مدرسہ اقتصادیات (Manchester School of Ecnomics) نے جو سبز باغ ہم کو شروع شروع میں دکھائے تھے۔ ان کی حقیقت اور وقعت سراب (آنکھوں کا دھوکا) سے زیادہ نہیں ہے۔ اور ہندوستانی قوم ہر گز ترقی نہیں کر سکتی۔ اگر وہ معدودے چند خوشحال سرمایہ داروں پر اور پچانوے (۹۵) یا زیادہ فی صد بھوکوں پر مشتمل ہو گی۔ جہاں سرمایہ دار فاقہ مستوں کو مخاطب کر کے کہیں۔

غوغائے کارخانہ آہنگری زمن　　گلبانگ ارغنون کلیسا ز آن تو

نخلے کہ شہ خراج بر ومی نہد زمن　　باغ بہشت و سدرہ و طوبیٰ ز آن تو

تلخابہ کہ درد سر آرو ز آن من　　صہبائے پاک آدم و حوا ازان تو

مرغابی و تدرو د کبوتر از آن من　　ظل ہما د شہپر عنقا از آن تو

ایں خاک و آنچہ از شکم ادزان من　　وز خاک تا بہ عرش معلی از آن تو

سرمایہ داری میں سرے سے یہ صلاحیت ہی نہیں۔ کہ دنیا کی اچھی چیزوں اور نعمتوں کو محبت اور انصاف کے اصول کے مطابق تقسیم کرے۔ لیکن خدا نے اس دنیا کی نعمتیں سب کے لئے رکھی ہیں۔ اور اس کا یہ ہر گز مطلب نہیں ہے۔ کہ ان نعمتوں کی تقسیم موجودہ اقتصادی حالات کے مطابق خودی اور طمع کی بنا پر کی جائے۔

(3)

فی زمانہ میں روس ایک ایسا ملک ہے جس میں اشتراکیت نے اپنی اقتصادیات کی بنیاد مقابلہ کی بجائے اتفاق، موالات اور کوآپریشن پر رکھ کر بیس (۲۰) سال کے اندر عظیم پیمانے پر ایسا انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ جس کی نظیر تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ پس ہمارے ملک کے نوجوان خیال کرتے ہیں کہ اگر ہندوستان میں بھی اشتراکیت کا بول بالا ہو جائے۔ تو ہمارے کل اقتصادی مسائل حل ہو جائیں گے۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ اشتراکیت کا سب سے زیادہ دلکش اور روشن پہلو یہی ہے کہ اس نے اپنی اقتصادیات کی بنیاد کو آپریشن پر رکھی ہے۔ لیکن کوئی صحیح العقل شخص اشتراکیت کے بدنما داغوں کی طرف سے اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ اشتراکیت سوسائٹی کے مختلف طبقوں میں منافرت کے جذبات پھیلاتی ہے۔ اور مزدوروں کی جماعت کو یہ

تلقین کرتی ہے کہ سرمایہ داروں کے وجود کو دنیا سے نابود کر دیا جائے علاوہ ازیں اشتراکیت کے پاس ایسے محرکات اور معلات نہیں۔ جن کے ذریعہ وہ لوگوں کو سرمایہ داری کی جانب سے ہٹا سکے۔ اور انسان کی خودی اور طمع پر غالب آ سکے۔ پس وہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے لوگوں کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اس کے پروگرام پر عمل کریں۔ پس اشتراکیت خودی اور طمع کا قلع قمع نہیں کر سکتی۔ کیونکہ ان کا تعلق غیر مادی امور کے ساتھ ہے۔ جن کا اشتراکیت سرے سے انکار کرتی ہے۔ اشتراکیت تعدی، جبر و تشدد، قتل اور خون کے ہتھیاروں سے اپنا کام نکالتی ہے۔ اور آزادی کی دشمن ہے، مادیت، الحاد، اور لامذہبی اس کی بنیادیں ہیں۔ وقت کوتاہ و قصہ طولانی، ورنہ روس کی گذشتہ بیس (۲۰) سالہ تاریخ سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ کہ اس کا ایک ایک ورق ان باتوں کی زندہ مثال ہے۔

(4)

پس لازم ہے کہ ہندوستان کسی ایسے سیاسی اور اقتصادی لائحہ عمل کی تلاش کرے۔ جس میں اشتراکیت کی تمام خوبیاں موجود ہوں۔ لیکن اس کی برائیاں مفقود ہوں۔ مسیحی مذہب کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کے پاس اس قسم کا تعمیری پروگرام موجود ہے۔ جس کا نام مسیحی اصطلاح نے ''خدا کی بادشاہت'' رکھا ہے۔ اور وہ پروگرام روسی اشتراکیت کا جواب ہے۔ مسیحیت کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ بادشاہت اٹل ہے۔ اور اس کا بادشاہ ازلی اور ابدی بے نظیر شخصیت کا مالک ہے۔ اور اس کا لائحہ عمل ایک ایسا پروگرام ہے۔ جو عالمگیر ہے۔ یہ بادشاہت پروگرام کو مرتب کرتی ہے۔ اور اس کا بادشاہ لوگوں کو اس کے پروگرام پر عمل کرنے کی توفیق عطا کرتا ہے۔ آؤ ہم چند لمحوں کے لئے دیکھیں، کہ آیا مادہ پرست اور ملحدانہ اشتراکیت ہندوستان کی اقتصادی مشکلات کو حل کرے گی یا اس مبارک کام میں ''خدا کی بادشاہت'' کے اصول ہمارے راہنما ہوں گے۔

(5)

خدا کی بادشاہت کے بنیادی اصول یہ ہیں۔ کہ خدا ہمارا باپ ہے۔ جو ہر فرد بشر سے ازلی اور ابدی محبت کرتا ہے۔ اور کل بنی نوع انسان بلا لحاظ ذات، مذہب، نسل، رنگ، قوم اور ملک وغیرہ ایک دوسرے کے بھائی اور خدا کی بادشاہت کے شریک ہیں۔ اس بادشاہت کے بانی کا ارشاد ہے کہ ''تمہارا باپ ایک ہی ہے جو آسمان پر ہے اور تم سب بھائی ہو'' (متی ۲۳: ۸)۔

یہ پہلا سبق ہے کتاب ہدا کا کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

اس مواخات کی وجہ سے ہر شخص پر یہ فرض عائد کر دیا گیا ہے کہ وہ دوسروں سے اس طرح محبت کرے جس طرح اپنے آپ سے محبت کرتا ہے۔ ہر ایک شخص کو جو خدا کی بادشاہت کا ممبر ہے مساوی حقوق حاصل ہیں۔ پس خدا کی بادشاہت کا اصل الاصول محبت ہے۔ اور اخوت و مساوات اس بادشاہت کے بنیادی اصول ہیں۔

محبت ،اخوت اور مساوات کے اصول کا یہ تقاضہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جائے ، جو ہر انسان اپنے لئے چاہتا ہے۔ سچ پوچھو، تو حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان محبت کے اصول پر عمل کرے تو یہ جان لو کہ اس نے تمام شریعت پر عمل کر لیا۔ چنانچہ انجیل جلیل میں ارشاد ہوا ہے کہ "آپس کی محبت کے سوا کسی چیز میں کسی کے قرضدار نہ ہو۔ کیونکہ جو شخص دوسرے سے محبت رکھتا ہے۔ اس نے شریعت پر پورا عمل کر لیا۔ کیونکہ یہ احکام کہ زنا نہ کر، خون نہ کر، چوری نہ کر، لالچ نہ کر، اور ان کے سوا اور جو کوئی حکم ہو، ان سب کا خلاصہ اس بات میں پایا جاتا ہے کہ اپنے ابنائے جنس سے اپنی مانند محبت رکھ۔ محبت اپنے ابنائے جنس سے بدی نہیں کرتی۔ اس واسطے محبت شریعت کی تعمیل و تکمیل ہے "(رومیوں ۱۳ باب)۔ تمام حقوق العباد اسی زمرہ میں آجاتے ہیں۔ پس محبت کا اصل الاصول جامع اور مانع ہے۔ جو تمام آئین و قوانین اور فقہ پر حاوی ہے۔

خلل پذیر بود ہر بنا کہ مے بینی

مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

یہ اصل انسان کے روزمرہ کے فرائض کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔ اور انسانی اخلاق کا نصب العین قرار دے دیا گیا ہے۔ پس خدا کی بادشاہت کے اس اصل نے ہر قسم کی درجہ بندی تفریق اور تمیز کو مٹا دیا۔ اور جس بات کو اشتراکیت نے آج جبر اور تشدد کے ذریعہ حاصل کیا ہے دو ہزار سال ہوئے، کلمتہ اللہ نے محبت کے زرین اصل کے ذریعہ اس کو حاصل کرنے کا راستہ دکھا دیا تھا۔

محبت کا اصل خودی کا عین نقیض ہے۔ محبت اور خودی اجتماع الضدین ہیں۔ جہاں محبت ہے وہاں خودی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ محبت کا جوہر خود انکاری اور ایثارِ نفسی ہے۔ اسی طرح طمع اور محبت دونوں ایک دوسرے سے بیگانہ ہیں۔ کلمتہ اللہ نے سرمایہ داروں کو فرمایا کہ "کوئی شخص دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یا تو وہ ایک سے عداوت رکھے گا۔ اور دوسرے سے محبت ، اور یا ایک سے ملا رہے گا۔ اور دوسرے کو ناچیز جانے گا۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے" (متی ۶: ۲۴)۔ ابن اللہ نے طامع لوگوں کو فرمایا "خبردار ہر طرح کے لالچ سے اپنے آپ کو بچائے رکھو کیونکہ کسی کی زندگی اس کے مال کی کثرت پر موقوف نہیں "(لوقا ۱۲: ۱۵)۔ کلمتہ اللہ کی نگاہ میں طمع گناہ کبیرہ میں سے تھا۔ چنانچہ انجیل مقدس میں وارد ہوا ہے کہ "لالچ بت پرستی کے برابر ہے" (کلسیوں ۳: ۵)۔ یہی وجہ تھی کہ مالدار اور سرمایہ دار اشخاص کلمتہ اللہ اور آپ کے حوارئین سے کنارہ کش رہتے تھے۔

(6)

پس کلمتہ اللہ کی تعلیم کے مطابق خدا کی بادشاہت کی بنیاد کسی ایسے اصل پر مبنی نہیں ہو سکتی۔ جس کا تعلق خودی اور طمع کے ساتھ ہو۔ پس اس بادشاہت کے اقتصادی نظام اور اصول تقابل اور (Competition) پر قائم نہیں ہو سکتے۔ بلکہ صرف کوآپریشن موالات اور محبت کے اصول پر ہی قائم ہو سکتے ہیں۔۔۔

ایسا کو آپریشن اشتراکیت کی طرح جبر و تشدد، قتل وخون کے ذریعہ معرض وجود میں نہیں آسکتا۔ بلکہ الٰہی، محبت، اخوت اور مساوات اس بادشاہت کی سیاسیات اور اقتصادیات کی محرک اور بنیاد ہیں۔ پس خدا کی بادشاہت کے تصور میں وہ عنصر جو اشتراکیت کا روشن پہلو ہے۔ بطرز احسن موجود ہے۔ اور وہ تمام عناصر جو اشتراکیت پر بدنما دھبے ہیں۔ اس تصور سے نکبتہً غائب ہیں۔ اس بادشاہت میں ملوکیت اور اشتراکیت کے بدترین عناصر یعنی جور و ظلم، تعدی (ناحق، حد سے بڑھ جانا) اور استبداد (ظلم وجور سے حکومت کرنا، ضد)، عقوبت (سزا) وتعذیب، جدال وقتال کو دخل نہیں، کیونکہ اس کی اقتصادیات، محبت، وشفقت، ہمدردی اور رحم، حق اور عدل، فروتنی انکساری اور خلق خدا کی خدمت پر قائم ہیں۔ پس اس بادشاہت کے ممبروں پر عداوت اور نزاع۔ کینہ اور حسد، غصہ اور شقاق بغض، اور قتل، مستی اور لہو ولعب ممنوع اور حرام ہیں۔ کیونکہ یہ سب باتیں اس کے اصول کے خلاف ہیں۔ کیونکہ محبت اور خوشی اطمینان اور تحمل، نیکی اور ایمانداری۔ تواضع اور پرہیز گاری اس بادشاہت کے اصول کے عملی نتائج ہیں (گلتیوں ۵: ۱۹ وغیرہ)۔

پس کلمتہ اللہ نے خدا کی بادشاہت کے قوانین کو ایک جامع اصل محبت کے ماتحت کر دیا۔ اور مسیحیت نے اپنے اقتصادی لائحہ عمل کو اس جامع اصل کے ماتحت مرتب کیا ہے۔ اگر ہم اپنے ابنائے جنس سے اپنے برابر محبت کریں گے۔ تو افلاس اور غریبی کا خود بخود قلع قمع ہو جائے گا۔ چنانچہ عبرانیوں کی انجیل میں ایک واقعہ کا ذکر ہے جو انجیل متی پر مبنی ہے کہ "ایک دولتمند نے جناب مسیح کو کہا اے آقا میں کیا کروں کہ زندگی حاصل کروں۔ آپ نے جواب دیا۔ میاں شریعت اور صحائف انبیاء پر عمل کر۔ اس نے کہا کہ ان سب پر میں نے عمل کیا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ جا جو کچھ تیرا ہے بیچ کر غریبوں کو دے۔ اور آکر میرے پیچھے ہولے۔ اس پر وہ سرمایہ دار برہم ہو گیا۔ کیونکہ یہ بات اس کی طبع پر ناگوار گذری۔ جناب مسیح نے اس کو کہا۔ تو کس طرح کہہ سکتا ہے کہ میں نے شریعت اور صحائف انبیا پر عمل کیا ہے۔ درآں حال یہ کہ شریعت میں لکھا ہے کہ اپنے ابنائے جنس سے اپنی مانند محبت رکھ۔ دیکھ تیرے بہت سے بھائی جو آل ابراہیم ہیں چیتھڑوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور بھوکوں مر رہے ہیں۔ اور تیرا گھر مال، اسباب اور سامان خورد ونوش سے بھرا پڑا ہے۔ اور اس میں سے کچھ نہیں نکلتا"۔

(7)

جب ابن اللہ معبوث ہوئے۔ اور آپ نے خلق خدا کو نجات کا پیغام دینا شروع کیا۔ تو ابتدا ہی میں پہلی بات جو آپ نے کی وہ یہ تھی۔ کہ آپ نے خدا کی بادشاہت کا پروگرام مرتب کیا۔ اور مرتے دم تک آپ اس لائحہ عمل پر کار فرما رہے۔ آپ نے سبت کے روز جب خلق خدا ناصرت کے عبادت خانہ میں جمع تھی۔ بھرے مجمع میں کھڑے ہو کر اپنی زبان معجز بیان سے فرمایا "خدا نے مجھے مسح کیا ہے۔ تاکہ غریبوں کو جن کو دولتمندوں نے پاؤں تلے روندر کھا ہے۔ خوشخبری دوں۔ ان کو جو مجلسی اور سیاسی قیود کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ رستگاری بخشوں۔ ان کو جن کے بدن چور اور شکستہ ہیں۔ اور جن کے ماحول ناگفتہ بہ ہیں۔ شفا اور طاقت دوں۔ کچلے ہوؤں کو آزاد کروں۔ اور سب کو خدا کی بادشاہت کی بشارت دوں" (لوقا ۴ باب)۔ اس پروگرام کا پہلا قدم غریبوں اور مفلسوں سے متعلق تھا۔ اور آپ نے ببانگ بلند فرمایا کہ "مبارک ہیں وہ جو مفلس ہیں۔ کیونکہ خدا کی بادشاہت انہیں کی ہے" (متی ۵ باب)۔ ابن اللہ اس دنیا میں معبوث ہو کر آئے تاکہ دنیا کی کایا پلٹ دیں۔ اور ایک نیا آسمان اور نئی زمین معرض وجود میں آئے۔ اور یہ

دنیا جو خدا اور اس کے مسیح کی ہو جائے۔ بالفاظ دیگر خدا کی بادشاہت موجودہ دور کی جگہ لے لے۔ اس مقصد کو مد نظر رکھ کر جناب مسیح نے اپنا لائحہ عمل تجویز فرمایا۔ تا کہ خدا کی بادشاہت عالمگیر پیمانہ پر اس دنیا میں ہمیشہ کے لئے قائم ہو جائے۔

(8)

ابن اللہ نے اس پروگرام کی تفصیل کو تمثیلوں کے ذریعہ دنیا کے ذہن نشین کر دیا۔ اور سکھلایا کہ ہر شخص کی آمدنی اس کی ضروریات کے مطابق ہونی چاہیے۔ طوالت کے خوف کی وجہ سے میں صرف ایک تمثیل پر اکتفا کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ "آسمان کی بادشاہت اس گھر کے مالک کی مانند ہے جو سویرے نکلا، تا کہ اپنے انگوری باغ میں مزدور لگائے۔ اور اس نے مزدوروں سے ایک دینار روز ٹھہرا کر ان کو اپنے باغ میں بھیج دیا۔ پھر پہر دن چڑھے کے قریب نکل کر اس نے اوروں کو بازار میں بیکار کھڑے دیکھا۔ اور ان سے کہا تم بھی باغ میں چلے جاؤ۔ جو واجب ہے کہ تم کو دوں گا۔ پس وہ چلے گئے۔ پھر اس نے دوپہر اور تیسرے پہر کے قریب نکل کر ویسا ہی کیا۔ اور کوئی گھنٹہ دن رہے پھر نکل کر اوروں کو کھڑے پایا۔ اور ان سے کہا تم کیوں یہاں تمام دن بیکار کھڑے رہے؟ انہوں نے اس سے کہا اس لئے کہ کسی نے ہم کو مزدوری پر نہیں لگایا۔ اس نے ان سے کہا۔ تم بھی باغ میں چلے جاؤ۔ جب شام ہوئی تو باغ کے مالک نے اپنے کارندے سے کہا کہ مزدوروں کو بلا اور پچھلوں سے لے کر پہلوں تک ان کو مزدوری دے دے۔ جب وہ آئے۔ جو گھنٹہ بھر دن رہے لگائے گئے تھے۔ تو ان کو ایک ایک دینار ملا۔ جب پہلے مزدور آئے۔ تو انہوں نے یہ سمجھا کہ ہم کو زیادہ ملے گا لیکن ان کو بھی ایک ہی دینار ملا۔ تب وہ گھر کے مالک سے یہ کہہ کر شکایت کرنے لگے کہ ان پچھلوں نے ایک ہی گھنٹہ کام کیا ہے۔ اور تو نے ان کو ہمارے برابر کر دیا۔ جنہوں نے دن بھر کا بوجھ اٹھایا۔ اور سخت دھوپ سہی۔ اس نے جواب دیا۔ میاں میں تیرے ساتھ بے انصافی نہیں کرتا۔ کیا تیرا مجھ سے ایک دینار نہیں ٹھہرا تھا؟ جو تیرا ہے اٹھالے اور چلا جا۔ میری مرضی یہ ہے کہ جتنا تجھے دیتا ہوں۔ اس پچھلے کو بھی اتنا ہی دوں۔ کیا مجھے روا نہیں۔ کہ اپنے مال کے ساتھ جو چاہوں سو کروں؟ (متی ۲۰ باب)۔

اس تمثیل میں ہم دیکھتے ہیں۔ کہ مالک کو بیکاروں سے ہمدردی تھی۔ اور اس نے ان کو پوری مزدوری دے دی۔ کیونکہ اگر وہ بیکار تھے۔ تو وہ اپنے کسی قصور کی وجہ سے بیکار نہ تھے۔ بلکہ محض اس لئے بیکار تھے۔ کہ ان کو کسی نے مزدوری پر نہ لگایا تھا۔ اور بیکاری کے زمانہ میں ان کی ضروریات بدستور سابق تھیں۔ اور مالک نے ان کی ضروریات کے مطابق ان کو مزدوری دی۔ دوسری بات جو اس تمثیل سے عیاں ہے وہ یہ ہے کہ ہر مزدور کے حقوق مساویانہ ہیں۔ مالک نے کہا کہ میری مرضی یہ ہے کہ جتنا تجھے دیتا ہوں۔ اس پچھلے کو بھی اتنا ہی دوں۔ پس خدا کی مرضی یہی ہے کہ اس دنیا کی نعمتوں کی تقسیم میں سب مزدوروں کے حقوق مساویانہ ہوں۔ اور ہر شخص کو ان کی ضروریات کے مطابق انصاف سے بانٹا جائے۔ لیکن جس طرح اس تمثیل میں دیگر مزدوروں نے مالک کی منصفانہ تقسیم پر اعتراض کیا۔ اسی طرح فی زمانہ سرمایہ دار غربا کے حقوق تلف کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ اور نہیں چاہتے کہ ان کی حاجتوں اور ضرورتوں کے مطابق ان کی آمدنی ہو۔ لیکن خدا کی مرضی یہ ہے کہ ہر طرح کا غیر مساویانہ سلوک جو فطرت پر مبنی نہیں۔ خدا کی بادشاہت میں سے خارج کر دیا جائے کیونکہ یہ باتیں موجودہ طرز معاشرت نے سوسائٹی میں داخل کر دی ہیں۔ لیکن وہ فطرت کے خلاف ہیں۔ خدا کی بادشاہت کا طرز معاشرت ایسا ہے۔ جس میں ہر انسانی بچے کے لئے جو دنیا میں پیدا ہوتا ہے یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ دوسروں کی طرح اپنے فطری قواء

کے استعمال سے اعلیٰ ترین زینہ پر پہنچ سکے۔ پس خدا کی بادشاہت میں وہ دیواریں جو موجودہ سوسائٹی نے مختلف انسانوں کے درمیان حائل کر رکھی ہیں۔ مسمار کر دی جائیں گی۔ اور ہر انسان کے بچے کو مساوی موقعہ دیا جائے گا۔ تا کہ اس کے مختلف فطری قواء مناسب ماحول میں نشو ونما پا کر بنی نوع انسان کی ترقی کا موجب بنیں۔

ایک اور تمثیل کے ذریعہ (متی ۲۵ باب)۔ کلمتہ اللہ نے ہم کو یہ سبق سکھلایا ہے کہ جس شخص کو خدا نے اعلیٰ پیمانہ پر فطری قواء عطا کئے ہیں۔ اس سے خدا کی بادشاہت میں یہ اُمید کی جائے گی کہ وہ ان قواء کو اس طور پر استعمال کرے۔ کہ وہ قواء خدا کی بادشاہت کے قیام اور اس کے ممبروں کی ترقی کا باعث ہوں۔ پس ان دونوں تمثیلوں سے ہم یہ اخذ کرتے ہیں کہ مسیحیت کی اقتصادیات ان دو قوانین پر منحصر ہیں کہ اوّل مال کی فراوانی کے بہم پہنچانے میں ہر شخص اپنی اپنی لیاقت کے اندازے کے مطابق کام کرے۔ تا کہ نوع انسانی مرفہ الحال ہو جائے۔ اور دوم۔ مال کی تقسیم کے وقت ہر شخص کو اس کی ضروریات کے مطابق بانٹا جائے۔ ان اقتصادی قوانین پر عمل کرنے سے اعلیٰ لیاقت کے انسان اپنے قواء کو اپنی ذاتی اغراض اور منفعت کی تحصیل کی خاطر استعمال نہیں کریں گے۔ بلکہ ان کے قواء نوع انسانی کی ترقی اور خوشحالی کے لئے استعمال ہوں گے۔ بلکہ ان کے قواء نوع انسانی کی ترقی اور خوشحالی کے لئے استعمال ہوں گے۔ خدا کی بادشاہت میں اعلیٰ لیاقت کا شخص سیم وزر میں اور ادنیٰ لیاقت کا شخص خاک وخاشاک میں لیٹتا نظر نہیں آئے گا۔ بلکہ اعلیٰ اور ادنیٰ لیاقت کے انسان اپنی اپنی قابلیتوں کو بنی نوع انسان کی مرفہ الحال میں خرچ کریں گے۔ تا کہ ان لیاقتوں کے مجموعی نتائج اور ثمرات سے ہر شخص کا گھر پھلے اور پھولے۔

(9)

تاریخ کلیسیا میں ایسا زمانہ بھی گزرا ہے جب خدا کی بادشاہت کے مذکورہ بالا اقتصادی اصولوں پر عمل بھی کیا گیا۔ اور اس تجربہ نے یہ ثابت کر دیا۔ کہ یہ اصول محض کتابی اصول ہی نہیں بلکہ وہ عملی اصول بھی ہیں۔ چنانچہ جب ابن اللہ نے اس دنیا سے صعود فرمایا۔ تو انجیل جلیل میں لکھا ہے کہ "سب ایماندار ایک جگہ رہتے تھے اور ساری چیزوں میں شریک تھے۔ اور اپنی جائیداد اور املاک وموال کو فروخت کر کے ہر ایک کی ضرورت کے موافق تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ اور ہر روز یک دل ہو کر جمع ہوا کرتے تھے اور خدا کی حمد کرتے تھے اور سب لوگوں کو عزیز تھے۔ اور مومنین کی جماعت ایک دل اور ایک جان تھی۔ یہاں تک کہ کوئی شخص بھی اپنے مال کو اپنی ملکیت نہ سمجھتا تھا۔ بلکہ ان کی سب چیزیں مشترک تھیں۔ اور ان سب پر فیض عظیم تھا۔ کیونکہ اس گروہ میں سے ایک شخص محتاج نہ تھا۔ اس لئے کہ جو سرمایہ دار زمینوں یا گھروں کے مالک تھے۔ وہ ان کو بیچ بیچ کر فروخت کردہ چیزوں کی قیمت لا کر رسولوں کے قدموں میں ڈال دیتے تھے۔ پھر ہر ایک کو اس کی ضرورت اور احتیاج کے مطابق بانٹ دیا جاتا تھا (اعمال ۲ اور ۴ باب)۔

یہ اشتراکیت مسیحی اصول اقتصادیات کا نتیجہ تھی۔ لیکن اس قسم کی اشتراکیت میں اور روسی اشتراکیت میں بعد المشرقین ہے۔ کیونکہ

اول۔ اس اشتراکیت کی بنیاد مادیت، دہریت اور الحاد کی بجائے روحانیت اور خدا کی محبت پر قائم تھی۔

دوم۔ یہ اشتراکیت انسانی محبت پر مبنی تھی نہ کہ جبر اور تشدد پر، کسی شخص کو مجبور نہیں کیا جاتا تھا۔ کہ وہ اپنے املاک وموال کو فروخت کر کے ہر ایک کی ضرورت کے مطابق سب میں تقسیم کر دے۔

سوم۔ اس اشتراکیت کے قیام کا طریقہ یہ نہیں تھا۔ کہ سرمایہ داروں کے خلاف منافرت کے جذبات مشتعل کئے جائیں۔ تاکہ مزدوروں کی جماعت اور سرمایہ داروں کے طبقہ میں تصادم اور جنگ اشتراکیت کا پیش خیمہ ہوں۔ بلکہ سرمایہ داروں نے ازراہ محبت اپنے بھائیوں کی حاجتوں کو رفع کرنے کے لئے خود بخوشی خاطر اپنا مال واسباب فروخت کر کے سب چیزوں کو مشترک بنادیا تھا۔

اس قسم کی اشتراکیت اوائل مسیحی صدیوں میں قائم رہی۔ چنانچہ برنباس کے خط (70 تا 110ء) میں ہے۔

"تو اپنی تمام چیزیں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ مشترک رکھ اور اپنے کسی مال کو اپنی ذاتی ملکیت نہ سمجھ"۔

جسٹن شہید اور ٹرٹولین (110ء تا 180ء) غیر مسیحی بت پرست سرمایہ داروں کو کہتے ہیں کہ

"ہم مسیحی سب چیزوں کو مشرک رکھتے ہیں"۔

پطرس کے موعظت (دوسری صدی) میں مرقوم ہے کہ " اے سرمایہ داروں! یاد رکھو، کہ تمہارا فرض ہے کہ دوسروں کی خدمت کرو۔ کیونکہ تمہارے پاس تمہاری ضروریات سے کہیں زیادہ چیزیں موجود ہیں۔ یاد رکھو کہ جو چیزیں تمہارے پاس فراوانی سے موجود ہیں۔ وہ دوسروں کے پاس نہیں ہیں۔ پس وہ چیزیں ان کو دے دو۔ کیونکہ ان کا حق رکھنا تمہارے لئے شرم کا باعث ہے۔ خدا کے انصاف اور محبت کی پیروی کرو۔ تو تمہاری جماعت میں ایک شخص بھی محتاج نہیں رہے گا"۔ چوتھی صدی میں مقدس آگسٹین کہتا ہے کہ

" ذاتی ملکیت رکھنا۔ ایک غیر فطرتی حرکت ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے دنیا میں حسد، کینہ، بغض، عناد، جنگ وجدال، گناہ اور کشت وخون واقع ہوتے ہیں"۔

بشپ کلیمنس اول کہتا ہے کہ

"تمام دنیاوی چیزیں سب کے استعمال کے لئے مشترک ہونی چاہئیں۔ کسی کو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ یہ شے میری ہے ۔ وہ چیز تیری ہے اور فلاں چیز اس کی ہے۔ کیونکہ اسی سے انسانوں میں جدائیاں اور عداوتیں پڑتی ہیں"۔

(10)

پس ہندوستان کی پیچیدہ مالی مشکلات اور گنجیدہ اقتصادی مسائل کو سلجھانے کا واحد ذریعہ مسیحیت کے بانی کے پاس ہے۔ کلمتہ اللہ نے خدا کی بادشاہت کے تصور کے ذریعہ ایک ایسا لائحہ عمل ہندوستان کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ جس کا اصل الاصول محبت ہے۔ اور اس کی علت غائی یہ ہے کہ ہر قسم کی

خودی اور طمع کا استیصال کر دیا جائے تا کہ ان کی بجائے ایثار نفسی اور ہمدردی، حق اور عدل کا بول بالا ہو۔ اور ہر طرح کی درجہ بندی تفریق اور تمیز کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ تا کہ ان کی جگہ محبت اخوت اور مساوات قائم ہوں۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے مسیحیت کے پاس محرکات بھی موجود ہیں۔ اس بادشاہت کا لائحہ عمل اس بنا پر مرتب کیا گیا ہے کہ ہر شخص کو آپریشن (امداد باہمی) کے اصولوں کے ماتحت اپنی لیاقت کے اندازہ کے مطابق کام کرے۔ تا کہ نوع انسانی مرفہ الحال ہو جائے اور ہر ایک شخص کے لئے اس کی حاجتوں کے مطابق ضروریات زندگی مہیا ہو سکیں۔ اور اس دنیا میں کوئی فرد بشر محتاج نہ رہے۔ اور موجودہ معاشرت کی جگہ خدا کی بادشاہت قائم ہو جائے۔ جس کی نسبت ہر شخص کہہ سکے کہ۔

ایں زمیں را آسمانے دیگر است

فصل دہم

خلاصہِ کتاب

(۱)

اس رسالہ میں ہم نے انسانی فطرت کے چند اہم ابتدائی اور بسیط میلانات اور رجحانات پر بحث کی ہے۔ تاکہ یہ معلوم کریں کہ ان میلانات کے اقتضاؤں کو مسیحیت اور اسلام میں سے کون سا مذہب بطرز احسن پورا کر سکتا ہے۔

ہم نے دوران بحث میں دیکھا تھا کہ یہ میلانات جو فطرت نے ہماری سرشت میں پیدائش ہی سے ڈال رکھے ہیں۔ بذات خود نہ تو اچھے ہوتے ہیں۔ اور نہ برے۔ بلکہ یہ قواء انسانی خصلت کی اساس ہیں۔ اور ان میلانات سے ہماری عادات شکل پذیر ہوتی ہیں۔ گردوپیش کے حالات اور ہماری تعلیم وتربیت اور سوسائٹی کی صحبت کا اثر ہماری عادتوں کو اچھا یا برا بنا دیتے ہیں۔ اور جب یہ عادتیں پکی ہو جاتی ہیں۔ تو انسان اپنی بد عادتوں کا غلام ہو جاتا ہے جن کے پنجہ سے وہ محض نصیحت اور نیک اعمال کی دعوت کے ذریعہ چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ عادت کی شدید قوت کے سامنے پند ونصائح کی بس اتنی پیش جاتی ہے۔ جتنی سیلاب کے سامنے کسی تنکے کی۔ بس اس زبردست قوت پر غالب آنے کے لئے۔ انسان کو فضل اور توفیق درکار ہے۔ تاکہ وہ ایک نیا مخلوق بن جائے۔ اسلام نیک اعمال کی دعوت دیتا ہے۔ پند ونصیحت کرتا ہے۔ لیکن وہ محض راہ ہدایت دکھانے پر ہی اکتفا کرتا ہے۔ مسیحیت نہ صرف صراط مستقیم دکھاتی ہے۔ بلکہ اس پر چلنے کی فضل اور توفیق بھی عطا کرتی ہے۔ تاکہ انسان اپنی بد عادتوں پر غالب آکر اپنے خالق کے سامنے از سر نو زندگی بسر کر سکے۔ پس مسیحیت کو اسلام پر فوقیت حاصل ہے۔ اور اسی میں یہ صلاحیت ہے کہ دینِ فطرت ہو۔

(۲)

فصل دوم میں ہم نے خوف کی جبلّت پر نظر کی تھی اور یہ دیکھا تھا کہ دینِ فطرت کے لئے لازم ہے کہ اس جبلّت کو غیر معتدل طور پر برانگیختہ ہونے نہ دے جس سے انسان کا دل ڈر اور ہول کے مارے ہر وقت دہشت زدہ رہے۔ لیکن اسلام میں خدا کا تصور ہی ایسا ہے کہ جس سے انسان ہر وقت خائف اور ترساں رہتا ہے۔ وہ ایک قہار اور جبار ہستی ہے۔ لیکن مسیحیت میں خدا کی ذات محبت ہے۔ خدا ہمارا باپ ہے۔ جو ہم سے لازوال محبت کرتا ہے۔ مسیحیت میں اس ازلی محبت کے احترام کے جذبہ نے اسلامی خوف اور دہشت کے محرکات کی جگہ لے لی ہے۔ مسیحی جذبہ احترام میں جو خوف کا عنصر ہے وہ اس دہشت سے کوسوں دور ہے۔ جو اسلامی تعلیم کا لازمی نتیجہ ہے۔ پس مسیحیت کی تعلیم خوف کی جبلّت کا جائز استعمال کر کے ثابت کر دیتی ہے کہ اس میں دین فطرت ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ بخلاف اس کے اسلام اس جبلّت کو غیر معتدل طور پر برانگیختہ کر کے ارباب ودانش پر ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ دینِ فطرت نہیں ہو سکتا۔

(3)

جنسی جبلّت پر بحث کرتے وقت ہم نے دیکھا تھا کہ دینِ فطرت کا یہ کام ہے کہ وحدت ازدواج پر زور دے اور اس رشتہ کی پاکیزگی قیام، استواری، اور پائیداری کی تلقین کرے، عورت کو مرد کی شہوت پر آلہ کار ہونے کی بجائے اس کو ایک آزاد ذمہ وار ہستی قرار دے۔ مرد اور عورت کے جنسی حقوق کی مساوات کی تعلیم دے۔ لیکن اسلام تعداد ازدواج کو جائز قرار دیتا ہے۔ طلاق کی کھلے بندوں اجازت دیتا ہے۔ جو جنسی تعلقات کی جڑ کو کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ وہ عورت کو مرد کی کھیتی قرار دے کر طبقہ نسواں کو چاہ ذلت میں گرا دیتا ہے۔ اس کے برعکس مسیحیت جنسی تعلقات کو پاکیزہ قرار دے کر وحدت ازدواج پر اصرار کرتی ہے اور طلاق کی قطعی ممانعت کر کے اس رشتہ کو دائمی اور پائیدار قرار دیتی ہے۔ جہاں اسلام نے عورتوں کو انسان کا غلام بنا کر ان کے مستقبل کو تاریک کر رکھا تھا۔ مسیحیت ان مردوں کے ساتھ مساویانہ حقوق عطا کرتی ہے۔ اور عورت کو بجائے خود آزاد اخلاقی ہستی قرار دے کر ان کو ان کے جذبات اور افعال کا ذمہ وار گردانتی ہے۔

علاوہ ازیں اسلام میں تعداد ازدواج کی وجہ سے مرد کی جنسی جبلّت ہر وقت غیر معتدل طور پر برانگیختہ رہتی ہے اور اس ناواجب شدت اور تکرار عمل کی وجہ سے مرد کی جسمانی قوت پر برا اثر پڑتا ہے۔ اس کی ذہنی فعلیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور وہ بنی نوع انسان کی فلاح و بہبودی میں رتی بھر اضافہ بھی نہیں کر سکتا۔ اسلامی ممالک کی تاریخ اس حقیقت کی واضح ہے اور روشن تفسیر ہے لیکن مسیحیت میں جنسی جبلّت کی قوت وحدت ازدواج کی وجہ سے صرف اعتدال کے ساتھ استعمال ہو سکتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی جسمانی قوت اور اس کے ذہنی قواء بحال رہتے ہیں۔ جبلّت جنسی کی وافر اور فاضل قوت کو وہ بنی نوع انسان کی ترقی اور بہتری میں صرف کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس جبلّت کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ اپنے اقتضا کی عظیم قوت کو مختلف وجدانیات اور دیگر اقتضاؤں کو مستعار دے دیتی ہے۔ پس اس لحاظ سے بھی اسلام دینِ فطرت ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ لیکن اس کے برعکس مسیحی ایمان اور عمل ثابت کر دیتا ہے کہ مسیحیت ہی واحد دینِ فطرت ہے۔

(4)

فصل چہارم میں والدینی جبلّت پر بحث کرتے وقت ہم اس نتیجہ پر پہنچے تھے۔ دینِ فطرت کا کام ہے کہ طلاق اور دیگر تمام ایسی رکاوٹوں کو دور کرے۔ جو بچوں کی پرورش، حفاظت، تربیت، اور ان کے قواء کی نشوونما اور ترقی میں حائل ہوں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام ایسے قوانین ازدواج منضبط نہیں کرتا۔ جو والدینی جبلّت کے مددگار ہوں۔ برعکس اس کے وہ طلاق وغیرہ کی اجازت دے کر اس جبلّت کی اقتضاؤں کی راہ میں بے اندازہ رکاوٹیں ڈالتا ہے۔ لیکن مسیحیت ان تمام امور کو حرام اور ممنوع قرار دیتی ہے۔ جو جبلّت والدینی کے آزادانہ فعل میں خلل انداز ہوتے ہیں۔

علاوہ ازیں قرآن میں بچوں کے حقوق اور والدین کے فرائض اور ان کی بھاری ذمہ داریوں کا کہیں ذکر نہیں پایا جاتا۔ حالانکہ والدینی جبلّت کا تعلق ان امور کے ساتھ خاص طور پر وابستہ ہے۔ لہٰذا اسلام دینِ فطرت ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ لیکن اس باب میں مسیحی تعلیم ہر صاحب ہوش پر ثابت کر دیتی ہے کہ صرف مسیحیت ہی دینِ فطرت ہے۔

مسیحیت خدا کی ذات اور انسانی تعلقات کے ایسے تصورات کی تلقین کرتی ہے۔ جو والدینی جبلّت کے عین مطابق ہیں۔ خدا ہمارا باپ ہے۔ اور کل بنی نوع انسان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ چونکہ خدا بنی نوع انسان سے ابدی محبت رکھتا ہے۔ پس وہ اپنے گمشدہ فرزندوں کو راہ ہدایت پر لانے کی خاطر ہر طرح کا ایثار کام میں لاتا ہے۔ بعینہ جس طرح ماں اپنی مامتا کی ماری اپنے بچے کی خاطر ہر طرح کا دکھ اٹھاتی ہے اور ہر طرح کی قربانی کرنے کو تیار ہوتی ہے۔ لیکن اسلام میں اس قسم کی تعلیم کفر قرار دی جاتی ہے۔ کیونکہ قرآن کے مطابق خدا بے نیاز، اور بنی نوع انسان کی جانب سے لاپرواہ ہے۔ پس اسلامی تصور خدا والدینی جبلّت کے عین نقیض ہے۔ لہٰذا اسلام دینِ فطرت نہیں ہو سکتا۔

دینِ فطرت کا یہ بھی کام تھا کہ والدینی جبلّت کے میدان عمل کو وسعت دے تاکہ انسان کی معاشرتی زندگی میں اس ظلم قید اور زیادتی کی بندش ہو جائے۔ جو زبردست ہستیاں زیر دستوں، بیکسوں، لاچاروں، اور مصیبت زدوں پر روا رکھتی ہوں۔ ہم نے اس بارے میں مسیحی اور اسلامی تعلیم پر مبسوط (کشادہ) بحث کی تھی اور دیکھا تھا کہ مسیحی محرکات اور مرغبات نہ صرف اسلام میں مفقود ہیں بلکہ اسلام میں تقدیر کے مسئلہ پر ایمان رکھنے کی وجہ سے بنی نوع انسان کے مظلوم حصہ کی جانب سے ایک گونہ سخت دلی اختیار کر لیتا ہے۔ کیونکہ قرآن کی تعلیم ہے کہ "خدا نے تم میں سے بعض کو بعض پر جو فضیلت بخشی ہے۔ تم اس کی تمنا نہ کرو" (نساء36)۔ علامہ اقبال بھی اس امر کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں دیکھتے کہ

"قسمت اور تقدیر کا بدترین پہلو صدیوں سے دنیائے اسلام پر غالب رہا ہے"۔

پس والدینی جبلّت کے جس پہلو سے بھی ہم اسلام پر نظر کرتے ہیں وہ اس کے اقتضاؤں کو پورا کرنے سے قاصر نکلتا ہے۔ لیکن مسیحیت اس جبلّت کی ہر اقتضا کو بطرز احسن پورا کرتی ہے۔ لہٰذا وہی دین فطرت ہے۔

(5)

لڑاکا پن اور غصہ کی جبلّت پر تبصرہ کرکے ہم نے دیکھا تھا کہ دینِ فطرت کے لیے لازم ہے کہ اس جبلّت کی تربیت کرے تاکہ انسانی امور میں ضبط کی طاقت بڑھے اور یہ جبلّت اپنی ننگی حالت میں انسان کی معاشرتی زندگی میں نظر نہ آئے۔ لیکن اسلام قصاص اور جہاد کی تعلیم کی تلقین کرکے اس جبلّت کا مظاہرہ اس کی خاص صورت میں کرتا ہے۔ اس کے خلاف مسیحیت عفو اور محبت کا سبق دے کر اس جبلّت کی تربیت کرکے جہاد بالنفس پر زور دیتی ہے اور یوں ثابت کر دیتی ہے کہ اس میں دینِ فطرت ہونے کی اہلیت موجود ہے۔

علاوہ ازیں اس جبلّت کی تحت میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ دینِ فطرت کا کام ہے کہ اس جبلّت کا رجحان دیگر جبلّی میلانات کے اقتضاؤں کو حاصل کرنے کی جانب راغب کرے تاکہ اس جبلّت کی عظیم طاقت کی مدد سے دیگر اقتضاؤں کو کمک (حمایت) حاصل ہو اور وہ ان تمام مشکلات پر غالب آجائیں جو ان کے آزادانہ فعل میں رکاوٹ کا باعث ہیں۔ مثلاً مسیحیت لڑاکا پن اور جنگ جوئی کی جبلّت کی شدید طاقت کو اس جانب راغب کرتی ہے تاکہ غربت افلاس، بیماری، جہالت، گناہ، اور شیطان کا مقابلہ کرکے ان پر فتح حاصل کرے تاریخ اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ مسیحیت شیطانی طاقتوں کے خلاف اعلان جنگ کرکے ان کو شکست دیتی ہے۔ لیکن اسلام تقدیر کے مسئلہ پر ایمان رکھنے کی وجہ سے لوگوں کو ان کی قسمت پر چھوڑ دیتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ بھلائی اور برائی اللہ کی جانب سے ہے۔ پس اسلام میں صلاحیت ہی نہیں کہ اس جنگجوئی کی جبلّت کو برائی کے اکھاڑے کی جانب راغب کرے اور بنی نوع انسان کی فلاح اور بہبودی کا باعث ہو سکے۔ لیکن بخلاف اس کے مسیحیت کا یہ طغرائے امتیاز رہا ہے۔ پس جہاں تک اس جبلّت کا تعلق ہے۔ مسیحیت ہر پہلو سے دینِ فطرت ہے۔

(6)

تجسس اور استفسار کی جبلّت انسانی سرشت کا ایک لازمی حصہ ہے۔ پس دینِ فطرت کے لئے لازم ہے کہ اس جبلّت کو اپنے رعب اور اختیار سے نہ دبائے بلکہ اس کے میدان عمل کو وسیع کرنے میں کوشاں ہو تا کہ ہم نہ صرف اس دنیا کی اشیا کی نسبت مستفسر (تحقیق کرنے والا) ہوں بلکہ خدا کی معرفت اور عالم روحانیت کے حقائق کو بھی جہاں تک انسانی عقل کام کر سکتی ہے جان سکیں۔ لیکن جہاں جناب مسیح کا نمونہ اور تعلیم اس جبلّت کے اقتضاؤں کے پورا کرنے پر اصرار کرتی ہے وہاں قرآن کی تعلیم جابرانہ حکم صادر کر کے اس جبلّت کو دبانے کی کوشش کرتی ہے۔ ہم نے اس تحت میں اسلامی ممالک کی تاریخ پر ایک عمیق اور مبسوط بحث کی ہے اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ قرآن اسلامی ممالک کو خیالات کی آزادی کی اجازت نہیں دیتا اور تجسس، تفحص اور استفسار کے خلاف ہے۔ پس اسلام ہماری فطرت کی اس جبلّت کے اقتضاؤں کے ساتھ ایسا جابرانہ سلوک کر کے ثابت کر دیتا ہے کہ وہ دینِ فطرت کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس ہم نے اس موضوع پر مفصل بحث کر کے ثابت کر دیا ہے کہ مسیحیت ہر پہلو سے انسانی فطرت کی جبلّت تجسس کے تمام اقتضاؤں کو بدرجہ احسن پورا کرتی ہے لہٰذا وہی دینِ فطرت بھی ہے۔

(7)

جبلّت اجتماع پسندی کی بحث کے دوران میں ہم نے دیکھا تھا کہ ترقی کی ابتدائی منازل میں انسانی افراد کو بطور ایک فرد کے کسی قسم کی اہمیت اور وقعت حاصل نہ تھی۔ جماعت کی ہستی اور بقا بہترین نصب العین تھا اور اگر کسی فرد کی ہستی جماعت کے وجود میں خلل کا باعث ہوتی۔ تو وہ بے دریغ قتل کر دیا جاتا تھا۔ افراد کی قدر و قعت بطور ایک ذمہ دار فرد کے نہیں کی جاتی تھی۔ ہم نے قرآنی احکام پر نظر کر کے دیکھا تھا کہ اسلام اس حد سے آگے نہیں گذرا۔ اسلام کا نصب العین اسلامی جماعت کی ہستی بقا اور ترقی ہے اگر کسی انسان مثلاً مرزائے قادیانی کا وجود اس جماعت کے لئے باعث خطرہ ہے تو قرآنی احکام کے مطابق وہ گردن زدنی ہے۔ قرآن کے مطابق انسان ایک خود مختار آزاد ذمہ وار اخلاقی ہستی بھی نہیں ہے۔ لیکن کلمتہ اللہ کی یہ تعلیم ہے کہ ہر فرد بشر خدا کے حضور ایک ذمہ دار اخلاقی ہستی ہے۔ مسیحیت نے نفسِ انسانی کے احترام کا سبق سکھلا کر دنیائے اخلاق کی کایا پلٹ دی۔ اس کی نظر میں ہر مرد عورت اور بچہ کی ہستی قابل قدر اور وقعت ہے۔ اور یہی فطرت کی تعلیم ہے۔

علاوہ ازیں مسیحیت جہاں یہ تعلیم دیتی ہے کہ ہر فردِ بشر بذات خود قدر اور وقعت رکھتا ہے وہاں وہ یہ بھی تلقین کرتی ہے کہ ہر فرد اپنی جماعت قوم اور ملک کے ذریعہ ہی اپنی انانیت کو ترقی دے سکتا ہے۔ اور ہر انسان خدا کی خلقت کی خدمت کے ذریعہ اپنی روحانی ترقی کو حاصل کر سکتا ہے۔ پس مسیحی تعلیم نہ انانیت کو دباتی ہے اور نہ سوشل تعلقات کو مقدم قرار دیتی ہے، بلکہ اس تعلیم کے مطابق انانیت اور جماعت دونوں بنی نوع انسان کی فلاح

بہبودی اور کاملیت کی منزل کی طرف دوش بدوش گامزن ہوسکتے ہیں۔ لیکن اسلام میں یہ دونوں باتیں جیسا ہم اس بحث میں ثابت کرے آئے ہیں ایک دوسرے کے نقیض ہیں۔

جو تصورِ خدا مسیحیت پیش کرتی ہے وہ جبلّت اجتماع پسندی کے عین مطابق ہے لیکن اسلامی تصور خدا کو جاننے اور سمجھنے میں انسانی فطرت مدد نہیں دیتی اس لحاظ سے بھی مسیحیت کی تعلیم عین فطرت کے مطابق ہے لہٰذا وہی دینِ فطرت بھی ہے۔

(8)

دینِ فطرت کے لئے لازم ہے کہ تحکم اور خود نمائی کے جذبات کو حد سے بڑھنے نہ دے تاکہ غرور اور بیجا فخر کا قلع قمع ہو جائے اور کوئی شخص اپنی ترقی کی خاطر دوسروں کے حقوق کو اپنے پاؤں تلے نہ روندے، بلکہ اس کے برعکس دینِ فطرت ایسی تعلیم دے۔ جس سے جبلّت تحکم و عجز کی افراط تفریط کا سدباب ہو جائے اور انسان فروتنی اور ایثار کو کام میں لے کر حلیمی کے ساتھ اپنی انانیت کی نشوونما اور ترقی اور اپنی ذات کا اظہار جائز طور پر خلق خدا کی خدمت کے ذریعہ کرے۔

قرآن کے احکام ہی ایسے ہیں کہ تحکم اور خود نمائی حد اعتدال سے خود بخود تجاوز کر جاتی ہے۔ قرآنی تعلیم کے مطابق ایک مسلم بے دریغ غیر مسلموں کے حقوق کو اسلامی سیاسیات وجماعت کی ترقی اور اپنی ذات کے اظہار کے خاطر پائمال کر سکتا ہے اور یہ ہماری سرشت کی جبلّت کے خلاف ہے اس کے برعکس ابن اللہ نے اپنی زندگی نمونہ اور تعلیم سے ہر طرح کے غرور بیجالاف وگزاف اور فخر کی ممانعت کر کے یہ سکھلایا ہے کہ ہر انسان اپنی ذات کا جائز اظہار محبت کے ذریعہ اپنے ہم جنسوں کی خدمت کے وسیلے فروتنی اور حلم کے ساتھ کرے اور خدا کا شکر کرے کہ اس کو ایسا کرنے کا شرف بخشا گیا ہے۔ اربابِ دانش پر مخفی نہیں کہ یہ تعلیم اس جبلّت کے اقتضاؤں کے عین مطابق ہے۔ لہٰذا مسیحیت ہی دینِ فطرت ہے۔

(9)

جبلّت حصول اکتساب پر بحث کرتے وقت ہم نے یہ دیکھا تھا کہ دینِ فطرت کا یہ کام ہے کہ اس جبلّت کا رخ ادنیٰ اور بے حقیقت اشیا کی طرف سے ہٹا کر بہترین مقاصد کے حصول کی جانب لگایا جائے۔ لیکن اسلام میں کوئی ایسے محرکات ہم کو نہیں ملتے جو انسان کو اس مقصد کے سرانجام دینے کی جانب راغب کر سکیں۔ بخلاف اس کے مسیحیت نہ صرف کم قدر اشیا کو ادنیٰ بتلا کر ان کی اصل حقیقت ہم پر ظاہر کر دیتی ہے بلکہ اس جبلّت کی توانائی کو خلق خدا کی بہبودی کے حصول کی جانب راغب بھی کرتی ہے۔

علاوہ ازیں مسیحیت ایک ایسا نصب العین انسانی تخیل کے سامنے پیش کرتی ہے۔ جس کے حاصل کرنے میں جتنی زیادہ کوشش کی جائے وہ کم ہے۔ کلمتہ اللہ نے خدا کی بادشاہت کا نصب العین بنی نوع انسان کے سامنے پیش کیا اور فرمایا کہ اس نصب العین کو حاصل کرنے کی خاطر انسان سعی بلیغ اور از حد کوشش کرے۔ جتنی کوشش اس مقصد کی خاطر کی جائے گی اتنا ہی نوعِ انسانی کا فائدہ ہو گا۔ پس جو فاسد افراط کی صلاحیت اس جبلّت میں موجود تھی وہ

کلمتہ اللہ نے اس نصب العین کو قائم کر کے خارج کر دی۔ لیکن قرآن اور اسلام نے بنی نوع انسان کے سامنے کوئی ایسا تعمیری پروگرام یا نصب العین نہیں رکھا۔ جس کی جانب اس جبلّت کا رخ بدلا جاسکے اور نہ قرآن انسانی فطرت کی اس جبلّت کے فاسد افراط کے عنصر کی روک تھام کا انتظام کر سکتا ہے۔ پس اسلام میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ دینِ فطرت کہلایا جاسکے۔ اس کے برعکس مسیحیت نے ہر پہلو سے دین ِ فطرت ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

ختم شدہ